# معارف

جون ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

# سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ر روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ر روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ر روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ر روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ر روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ر روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ر روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

**HAFIZ SAJJAD ELAHI**

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH**

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

**Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org**

**Website: www.shibliacademy.org**

**Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh**

**Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100**

**✆ (Ma'arif Section) 06386324437**

---

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

# معارف

جلد نمبر ۲۰۵ ماہ شوال المکرم ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۰ء عدد ۶



دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

## فہرست مضامین

# شذرات

یہی رمضان المبارک کا مہینہ تھا جب بساط شبلی کے حاشیہ نشینوں نے اپنے محسن اعظم کی وصیت ووراثت کی تکمیل کے طور پر رسالہ معارف کو جاری کیا تھا۔قریب ۱۰۴ سال پہلے کے روزوں کے درمیان معارف کے مدیر اول کے سامنے زمانہ کا انقلاب یا انقلابات تھے۔انقلابات کی اپنی ہیئتیں اور شکلیں ہوتی ہیں۔علمی،فکری،معاشی،معاشرتی،سیاسی،طبی،طبعی اور غیر طبعی،روایت اور یکسانی کی راہ میں کوئی ایسا موڑ آجاتا ہے جو مانوس راہ اور فضا سے ایک دوسرے ہی ماحول اور احوال سے دوچار کردیتا ہے۔ایک صدی قبل علوم وفنون کے قالب بدلے،فلسفہ بدلا،تاریخ بدلی،فکر ونظر کے نام پر مضامین نو کے انبار لگنے لگے تو ظاہر ہے مذہبی علوم کو دیکھنے اور پیش کرنے کا اسلوب اور طرز تعبیر کو بدلنا ہی تھا۔ایک صدی قبل معارف کے طلوع کے وقت جو کرنیں ابھریں اور پھیلیں،انہوں نے علوم اسلامیہ کے افق پر یہی لکھا کہ آج اگر ہمارے اسلاف موجود ہوتے تو شاید وہ بھی اسی ناگزیر انقلاب کے نتیجے میں وہی کرتے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے علوم کے ساتھ کیا۔یہ اور بات ہے کہ اب وہ لوگ نہیں جن کو غزالی ورازی،بیرونی وابن ہیثم،ابن خلدون ومقریزی کے نام سے جانا جائے،تاہم اگر وہ نہیں تو کارِ انقلاب کو چھوڑا بھی نہیں جاسکتا،بہت سے بہت یہی ہوگا کہ جو بن آئے گا وہی کیا جاسکے گا۔معارف نے وقت کی اس ضرورت کو علامہ شبلی کے تخیلات سے تعبیر کیا اور بڑی وضاحت سے اعلان کیا کہ دراصل دارالمصنّفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخیلات کا نتیجہ ہے۔

---

ایک رمضان ۱۹۱۶ء کا تھا،آج کا رمضان ۲۰۲۰ء کا ہے۔زمانہ کی گردشوں کو،اس کی ساعتوں کو بلکہ ہر ہر پل کو الٹ پھیر کے عمل کے ذریعہ زیروزبر کرنا،یہ قدرت وفطرت کی معرفت کی نشانی ہے۔ آج دنیا قدرت کی اس طاقت کا سامنا کررہی ہے جس کا ظہور ایسی شکل میں شاید ہی انسانی تاریخ کی کسی یادداشت سے منعکس ہوتا ہو۔عذاب آئے،ارضی وسماوی آفات،وبائی امراض،جنگ وخونریزی، انسانی تاریخ کے صفحات کو کبھی سرخ اور کبھی سیاہ کرتے گئے۔جن کو اپنی تہذیب وثقافت پر ناز تھا وہ

زمین اور زیر زمین کھنڈروں میں بدل گئے لیکن انسان کی چشم تر نے یہ موسم کب دیکھا کہ چند دنوں میں ساری دنیا بیک وقت ایک ہی عذاب میں ایسی مبتلا ہوئی کہ دنیا دنیا نہ رہی، قیامت سے پہلے عرصہ محشر میں بدل گئی۔ایک زہریلا مادہ محض اپنی وہمی وجود سے ان کی زبانوں اور عقل پر تالا لگا گیا جن کی رعونت من اشد منا قوۃ کے نعروں سے پرشور تھی۔کورونا بظاہر ایک لفظ جس کے معنی بھی اتنے خوفناک کیا برے بھی نہیں۔تاج یا ہالہ، اس سے تو عظمت و ہیبت اور تقدس ہی کا مفہوم نکلتا ہے لیکن کسے خبر تھی کہ چین کی سرزمین سے سر نکالنے والا یہ موہوم سا جرثومہ ساری دنیا کے لیے Coronach یعنی نوحہ و گریہ و ماتم کے معنی آشکار کرنے والا ہوگا۔نومبر ۲۰۱۹ء سے اب تک کورونا کا لفظ عالمی طور پر جتنا لکھا، بولا اور سنا گیا، شاید ابتدائے آفرینش سے چشم فلک نے دیکھا ہوگا اور نہ کائنات کی سماعت سے ٹکرایا ہوگا۔ جو لوگ قدرت اور فطرت دونوں کی حقیقت پر یقین رکھنے والے ہیں ان کے سامنے تو صرف یہی حقیقت ہے کہ ''ان اللہ الذی خلقھم ھو أشد منھم قوۃ''۔

---

عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک سو سال پہلے انفلوئنزا کی بیماری پھیلی تو معارف نے لکھا کہ ''خوفناک انفلوئنزا نے اسپین سے لے کر ہندوستان تک کی خاک اڑادی''۔یہی نہیں اس سے پہلے ۱۹۱۷ء میں جب عالمی طور پر انسانوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑا تو اس کو بھی عذاب الٰہی سے تعبیر کیا گیا، اس وقت قحط زدوں کی تعداد تین کرور سے زیادہ تھی۔نوے لاکھ صغیر السن بچے اس قحط کے نتیجے میں لقمۂ اجل ہوئے، بخار اور طاعون اور دیگر امراض سے جن کی زندگیاں گئیں ان کا تو شمار ہی نہیں۔سو سال بعد پھر وہی عالم کہ انسان اپنے سایہ سے لرزاں ہے۔روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے انسان کے سامنے اسی جیسے انسان کے پھیلے ہاتھ کی لکیریں کیا کیا نہیں کہہ رہی ہیں۔قدرت و فطرت کے مالک نے ایک بار پھر بتادیا کہ آخرت و عاقبت کو جن قوموں اور ذہنوں نے علانیہ ایک وہم اور ضعیف عقیدہ قرار دیا اور اپنی زندگی کا سارا مقصد دنیوی ترقی و مادی زندگی سمجھا، ان کی مساعی کا نتیجہ اگر یہی ہلاکت و بربادی ہے تو پھر اخلاقیات کے اس سبق کو کیوں نہ یاد کیا جائے جس کو تہذیب جدید کے نام پر ردی خانہ میں تغافل کی دیمکوں کی نذر کردیا گیا۔

---

کورونا اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ مسائل پر مفصل گفتگو کے لیے مدیر معارف جناب اشتیاق احمد ظلی کی تحریر کے قارئین مشتاق تھے اور ہیں، لیکن ان کی علالت اور ناسازی طبع کی وجہ سے ایک بڑی کمی کا احساس قارئین کے ساتھ ہم کو بھی ہے، ظلی صاحب کی بیماری، ڈاکٹروں کی نظر میں بے خوابی اور بے چینی اور ہمہ وقت کی اضطرابی کیفیت ہے۔ یہ اضطراب اور بے چینی اور رات رات بھر جاگنے کی اذیت کا سبب ممکن ہے کوئی جسمانی اختلال ہو لیکن ہمارے نزدیک حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ گذشتہ معارف میں انہوں نے دارالمصنّفین کے وجود اور بقا کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اشارہ کیا صاحبان فہم کے لیے وہ ایک صریح پیغام تھا کہ موجودہ حالات میں دارالمصنّفین کی مالی حالت گویا جاں کنی کے عالم میں ہے۔ ایک ایسا ادارہ جس کا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ ہو، اس نے سو سال کی عمر جس طرح پوری کی، کاش اس کا حساب کرنے کی امت کو توفیق ہوتی۔ تعریفوں کے پل بندھتے رہے، دارالمصنّفین کی خدمات کو شہرۂ آفاق کہا جاتا رہا لیکن جس قوم کی وہ امانت ہے خود اس کا رویہ کیا رہا۔ آزادی سے پہلے نظام حیدرآباد، بیگم بھوپال، نواب مزمل اللہ خاں وغیرہ جیسے علم پرور اور علم نواز موجود تھے جن کو دارالمصنّفین کے وجود کی ضرورت اور اس کے کاموں کی اہمیت کا احساس تھا مگر آزادی کے بعد زمین و آسمان تو وہی رہے لیکن بزم علم کی شمعیں ایک ایک کرکے بجھ کر تاریکی میں اضافہ کا اعلان کرتی رہیں۔ محترم ظلی صاحب کی خودداری دارالمصنّفین کے وجود کے آگے بے بس ہوتی نظر آتی ہے۔ کاش! ان کے اس مرض بے خوابی کی سنگینی کو قوم سمجھے ورنہ یہ درد تو بہت پرانا ہے۔ علامہ شبلی نے منشی امین زبیری کو لکھا تھا کہ ''ایک بغدادی شیخ کے استقبال میں ایک رات میں ۷۵ ہزار خرچ کرنے والی قوم کیا کسی علمی کام کے لیے دو ہزار بھی نکال نہیں سکتی؟'' سوال آج بھی اسی طرح جواب طلب ہے۔ قارئین سے ظلی صاحب کی صحت و عافیت کی درخواست دعا ہے کہ ان کی زندگی دارالمصنّفین کی زندگی سے جدا نہیں ہے۔

---

گذشتہ دنوں کتنے صاحبان فہم و ذکا اور خاصان علم و ادب اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، قمر اعظمی، ابرار اعظمی اور ابھی ابھی مولانا سعید احمد پالن پوری، ہم ان کی تعزیت بھی نہ کر سکے۔ اصل تو یہی ہے کہ ہم خود ان بزرگوں سے محرومی پر تعزیت کے لائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی نیکیوں کو قبولیت بخشے اور جنت الفردوس کو ان کا ماویٰ و مسکن بنائے۔

مقالات

# مطلع النجوم و مجمع العلوم (نجم نسفی)

## فارسی نثر و نظم کا ایک قدیم مأخذ

پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی

(۱)

یادش بخیر، مولانا امتیاز علی خان عرشی (۱۹۰۴-۱۹۸۱ء) جب کتب خانۂ رضا رام پور کے ناظم تھے، انھوں نے عالم اسلام اور ماوراء النہر کے ایک معروف عالم، فقیہ، صوفی، ادیب اور شاعر، نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد بن احمد نسفی سمرقندی (۴۶۱-۵۳۷ھ/۱۰۶۹-۱۱۴۲ء) کے احوال و آثار پر ایک مبسوط مقالہ بعنوان ''نجم النسفی'' لکھ کر ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کے تین شماروں، مارچ، اپریل، جون ۱۹۴۶ء میں بالاقساط شائع کروایا تھا۔

عرشی صاحب کے اس پُر مغز مقالے میں نسفی کی تصانیف کے ضمن میں القند فی معرفة علماء سمرقند اور مطلع النجوم و مجمع العلوم (اس کے بعد: مطلع) کے نام بھی آئے ہیں۔ القند کا تعارف تو ان کے قلم سے مختصر ہی رہا لیکن مطلع کے تعارف پر عرشی صاحب نے خوب لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ القند اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی اور شاید اس کا کوئی قلمی نسخہ بھی عرشی صاحب کی دسترس میں نہیں تھا لیکن مطلع کا قلمی نسخہ انھیں اپنے زیر انتظام رام پور کتب خانے میں دستیاب تھا اسی لیے اس کا مفصل تعارف لکھا۔ اب جب عرشی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے، یہ دونوں کتابیں (القند، مطلع) شائع ہو چکی ہیں۔ وہ زندہ ہوتے تو انھیں دیکھ کر یقیناً خوش ہوتے اور شاید اپنی تحقیق پر کچھ نظر ثانی بھی کرتے۔

پہلی کتاب، القند فی ذکر علماء سمرقند نام سے، یوسف الہادی نے تدوین و تصحیح کی اور دفتر نشر میراث مکتوب، آئینۂ میراث، تہران نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے،

---

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

یہ سمرقند کے علما کا تذکرہ ہے اور ہمیشہ سے ایک کثیر الافادہ کتاب رہی ہے۔

لیکن مطلع کسی قدر گمنام رہی ہے۔اس کی وجہ مطلع کے نسخوں کا دیر یاب اور کم یاب ہونا ہے۔اس کے اب تک دو ہی نسخے معلوم ہو پائے ہیں، ایک رام پور رضا لائبریری، رام پور ہندوستان (شمارہ مخطوطہ 5380 ) اور دوسرا ابوریحان البیرونی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند، ازبکستان (شمارہ مخطوطہ 1462 ) میں ہے۔نسخۂ رام پور کے بارے میں اطلاع ۱۹۴۶ء میں عرشی صاحب کے ذریعے منظر عام پر آئی اور نسخۂ تاشقند ایک روسی محقق بُلگاک آف (۱۹۲۷-۱۹۹۳ء) نے پہلی بار ۱۹۷۶ء میں متعارف کیا۔(۱) ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ مطلع کو علمی دنیا میں متعارف کرنے میں فضلِ تقدّم ہمارے عرشی صاحب کو حاصل ہے۔

عرشی صاحب کا متذکرۃ الصدر مقالہ بعد میں ان کے مجموعۂ مقالات: مقالات عرشی (شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہوا اور پہلی بار مطلع سے میری شناسائی کا وسیلہ بنا۔ راقم السطور جب نجم نسفی کے ایک ہم وطن اور ہم عصر، عبداللہ محمد بن ابی بکر قلانسی نسفی (وفات ۵۰۰ یا ۵۵۰ھ/ ۱۱۰۷ یا ۱۱۵۵ء) کی فارسی کتاب ارشاد (در معرفت و وعظ و اخلاق) مرتّب کر رہا تھا تو مطلع دیکھنے کی ضرورت پیش آئی، کیوں کہ دونوں کتابوں میں ماوراءالنہر کے قدیم فارسی شعرا کا کلام درج ہوا ہے۔میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ارشاد اور مطلع میں کوئی اشتراک ہے؟ لیکن ہندوستان سے اس قلمی کتاب کا عکس منگوانے میں حائل دیگر دشواریوں کے ساتھ ایک دشواری یہ تھی کہ عرشی صاحب نے مخطوطے کا شمارہ نہیں لکھا تھا، لہٰذا اس کی تلاش کی جائے تو کیسے؟ ناچار ارشاد کے حاشیے میں مقالات عرشی کے حوالے سے مطلع کا محض ذکر کر کے رہ گیا۔(۲) لیکن مطلع کو دیکھنے کی خواہش ارشاد کے چھپ جانے کے بعد بھی دل میں باقی رہی۔

ادھر راقم السطور اپریل ۲۰۱۸ء میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تاشقند گیا تو ابوریحان البیرونی مرکز مخطوطات شرقیہ بھی جانا ہوا۔میں مرکز کے لیے پاکستان سے بہت سی کتب تحفہ کے طور پر ساتھ لے گیا تھا وہ پیش کیں۔مرکز کے نائب مدیر نے رخصت کرتے وقت مجھے بھی ایک کتاب تحفے میں دی۔نظر اٹھا کر دیکھا تو مطلع کا مطبوعہ نسخہ تھا۔میں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔یہ تاشقند نسخے کی عکسی (facsimile) اشاعت تھی جسے اسی مرکز نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا تھا۔اس کی تحقیق و اعداد سید اکبر

محمد امین اف (پورا نام: سیداکبر عبدالرشید وچ محمد امین اف) کی ہے۔تاشقند کے سفر میں دلچسپ امر یہ تھا کہ سیداکبر محمد امین اف پچھلے دو روز سے مجھے اپنی کار میں بٹھا کر تاشقند کی سیر کروا رہے تھے، لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ انھوں نے یہ کارنامہ بھی انجام دے رکھا ہے۔میری شادمانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے نسخۂ رام پور کے علاوہ، مطلع کے کسی دوسرے نسخے کا علم نہ تھا۔یہ گویا پکا ہوا پھل تھا جو اچانک میری جھولی میں آن گرا۔ورنہ کسی غیر ملکی کے لیے ابوریحان البیرونی انسٹی ٹیوٹ سے کوئی قلمی نسخہ لینا تو درکنار، دیکھنا بھی محالاتِ روزگار میں سے ہے۔

مطلع کا جو نسخہ تاشقند سے شائع ہوا ہے یہ رحلی تقطیع میں، XLVI + ۸۴۸ صفحات پر مشتمل ہے (قلمی نسخے کی تقطیع 27.5X30cm ہے)۔نسخے پر قدیم ورق شمار عربی اعداد میں موجود ہیں جن کے مطابق یہ نسخہ ۳۵۳ ورق پر مشتمل ہے (پہلے دو ورق پر شمار نہیں ڈالا گیا، اس اعتبار سے کل ۳۵۵ ورق بنتے ہیں) لیکن ناشر نے سہولت کے لیے اپنی طرف سے انگریزی اعداد ڈالے ہیں۔ایک عدد ہر صفحے کے اوپر دائیں اور بائیں کونے پر ہے اور مخطوطات کی ورق شماری کی روایت کے مطابق ہر عدد a اور b پر مشتمل ہے۔اس اعتبار سے یہ متن 355b ورق پر مشتمل ہے اور زیر نظر مقالے میں انھی اعداد کا حوالہ دیا گیا ہے۔ہر صفحے کے نچلے کونوں پر مسلسل انگریزی اعداد ڈالے گئے ہیں، ان کے مطابق:

مرتب اور ناشر کی طرف سے کتاب کا عربی سرورق اور فہرست مضامین ص 1۔5۔

مطلع کے نسخے کا عکس، 7۔721۔

فہارس (اسماء الاشخاص، التسمیة الجغرافیة، فہرست اسماء الجماعات و الفرق والحیل والاقوام و القبائل)، 723۔848۔

ازبکی، انگریزی و روسی سرورق اور مرتب کی طرف سے انھی تین زبانوں میں تعارفی مقالات، I-XLVI۔

محمد امین اف مطلع کے محتویات اور نسخۂ تاشقند پر ازبکی اور انگریزی میں تفصیلی تعارفی مقالات جداگانہ بھی چھپوا چکے ہیں۔(۳)

طبع تاشقند پر مختصر تبصرہ: کیا ہی بہتر ہوتا کہ کتاب پر عربی زبان میں بھی تعارفی مقالہ شامل کیا جاتا کیونکہ مطلع بنیادی طور پر عربی تصنیف ہے۔

محمد امین اف نے اپنے تعارفی مقالات میں بالواسطہ طور ایرانی محقق ایرج افشار (۱۹۲۵-۲۰۱۱ء) کے ایک مقالے (۴) کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے:

"اگرچہ ایرانی (کذا) دانشمند امتیاز علی عرشی نے مطلع کے ایک نسخہ مکتوبہ ۶۴۶ھ کی بات کی ہے اور اس سے فارسی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ نسخہ کہاں کتابت ہوا اور اس وقت کہاں محفوظ ہے۔" (۵)

اسی لیے محمد امین اف اپنے تعارفی مقالات میں مطلع کے نسخۂ تاشقند کے منحصر بہ فرد ہونے کی بات کرتے ہیں۔ (۶) محمد امین اف نے ایرج افشار کے حوالے سے جو بات لکھی ہے اس کی درستی میں نے موقع پر ہی تاشقند میں کردی تھی اور انھیں بتایا کہ عرشی صاحب ایرانی نہیں، ہندوستانی دانشمند ہیں اور مطلع کا وہ نسخہ، رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ اطلاع پانے کے بعد محمد امین اف نسخۂ رام پور کے حصول کے لیے مجھ سے بھی زیادہ بے تاب ہوگئے، کیونکہ اگلے مرحلے میں وہ مطلع میں شامل بعض رسائل کا تنقیدی متن شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت انھیں یقیناً تقابل کے لیے دوسرے نسخے کی ضرورت پیش آئے گی۔

میں نے تاشقند سے وطن واپس آکر کئی سال کے تعطل کے بعد، ایک بار پھر نسخۂ رام پور کے حصول کے لیے سلسلہ جنبانی کیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت رضا رام پور کتب خانے کے ناظم علم دوست ڈاکٹر سید حسن عباس تھے۔ انھوں نے نومبر ۲۰۱۸ء میں مجھے اس نسخے کا مکمل عکس فراہم کردیا جس کے لیے ان کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ڈاکٹر حسن عباس اب رام پور سے جا چکے ہیں۔ اگر وہ اُس زمانے میں کتب خانے کے منتظم نہ ہوتے تو یقیناً میرے لیے نسخۂ رام پور کا حصول ناممکن تھا۔

**نسخۂ رام پور:** عرشی صاحب کے بقول رام پور کا نسخہ بدنما نسخ میں لکھا گیا ہے اور کئی کاتبوں کا رہینِ منّت ہے، اس کی کتابتی غلطیاں حدِّ شمار سے باہر ہیں، بالخصوص فارسی عبارتیں تو مسخ ہیں۔ روشنائی سیاہ اور عنوان شنگرفی ہیں۔ عرشی صاحب اس نسخہ کے مغلوط اور بے اعتبار ہونے کی بار بار شکایت کرتے ہیں۔ نسخۂ رام پور کا ناقص الاوّل، کرم خوردہ اور آب رسیدہ ہونا اس پر مستزاد ہے۔ یہ ۵۰۴ ورق پر مشتمل ہے۔ نسخے پر پنسل سے جو جدید نمبر لگائے گئے ہیں وہ اس کے کل ۱۰۰۷ صفحات ظاہر کرتے ہیں۔

نسخۂ رام پور جس نسخے سے نقل ہوا ہے وہ بھی تین مختلف کاتبوں کی مشترکہ کاوش ہے۔ رام پور کا

منقول عنہ نسخہ ۶۴۵-۶۴۶ھ/ ۱۲۴۷-۱۲۴۸ء) میں کتابت ہوا۔ نسخے کا غالب حصہ بخارا کے مدرسہ تاج المدارس میں ابوالمحامد حامد بن عاصم بن عثمان بن اسحاق بن ابی طاہر ملقب بہ حسام نے کتابت کیا، کتاب التواریخ کی کتابت ابوسعد مسعود بن محمود ملقب بہ کمال نے کی اور کتاب الصکوک کی کتابت عاصم بن محمد بن عثمان (مذکور) نے کی۔ بخارا میں کتابت شدہ اس نسخے کے کاتبوں کے پیش نظر مطلع کا وہ نسخہ تھا جو مصنف (نجم نسفی) کے بیٹے مجد نسفی نے اپنے والد کے املا پر سمرقند کے محلہ سکۃ البادین کی مسجد میں محرم کی آخری تاریخ ۵۳۴ھ (۱۳ اکتوبر ۱۱۳۹ء) کو ختم کیا تھا۔ نسخہ تاشقند میں کتاب الخطب کے کاتب الاسمیتنی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اس کا منقول عنہ نسخہ وہ ہے جو نجم نسفی نے ۲۷ تاریخ (مہینہ کا نام درج نہیں ہے) سال ۵۳۳ کو مسجد سکۃ البادین سمرقند میں املا کروایا تھا۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ نسخۂ رام پور کے منقول عنہ (نسخۂ بخارا) اور تاشقند کے موجودہ نسخے کا مادر نسخہ ایک ہی ہے۔

**نسخۂ تاشقند:** نسخۂ تاشقند نہ صرف مکمل ہے بلکہ اس کا خط بھی نسخۂ رام پور کے مقابلے میں پختہ اور خوانا ہے۔ اسے دو کاتبوں نے مل کر لکھا ہے۔ پہلے 162a اوراق (ابتدائی ۱۲ علوم وفنون) کے کاتب محمد بن حامد بن علی ملقب بہ شرف الحامدی البخاری ہیں۔ انھوں نے کتاب تحصیل اصول الفقہ کے اختتام پر تاریخ ۲۳ رجمادی الاولیٰ ۶۴۷ھ لکھی ہے (44a) اور کتاب المشارع الشرایع کی کتابت رجب ۶۵۷ھ کو ختم کی جس کے ترقیمے میں کاتب نے اپنے ممدوح امام ابوالصفا بن شیخ المشائخ عزالحق والدین الپارسا کا نام طویل القاب کے ساتھ لکھا ہے۔ نسخے کے بقیہ اوراق جو کتاب المذاکرہ والامتحان فی المسایل الحسان سے شروع ہوتے ہیں (163b)، آخر تک، محمد بن محمد بن حسین بن احمد الاسمیتنی مدعو بہ نجم الدین الکوفی نے کتابت کیے ہیں۔ کاتب ثانی نے کئی رسائل کے اختتام پر اپنا نام اور تاریخ کتابت لکھی ہے۔ یہ عرصۂ کتابت ۲۱ رجب ۶۵۷ تا ۶ محرم ۶۶۷ھ ہے۔ کاتب ثانی نے چند ایک مقامات پر اظہار کیا ہے کہ نقل کے وقت اس کے پیش نظر مطلع کا وہ نسخہ تھا جو مصنف (نجم نسفی) نے خود اپنے شاگردوں کو املا کروایا تھا۔ جیسے کتاب الخطب کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ اس نسخے سے کتابت ہوا ہے جو استاد نجم نے ۵۳۳ھ میں سمرقند میں مسجد سکۃ البادین میں املا کروایا تھا (227a)۔ کتاب الجوامع اللوامع کے ترقیمے میں بھی بتایا ہے کہ اسے اس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے جو شیخ مصنف نے اپنے اصحاب کو ۱۶ شعبان ۵۳۲ھ کو املا کروایا تھا (280a)۔ کتاب الاشعار کی کتابت املائے مصنف

والے نسخے مکتوبہ ۲۷رمضان ۵۳۲ بمقام سمرقند سے کی گئی ہے (292a)۔ کتاب الصناعات کا منقول عنہ نسخہ، نجم نسفی نے ۲۲رذی الحجہ ۵۳۲ کو مسجد کوے نمدگراں، سمرقند میں املا کروایا تھا (304a)۔ اس کے علاوہ بھی کئی رسائل کے آخر میں نسخۂ مصنف سے براہ راست نقل لینے کا اظہار ہوا ہے، یہاں طوالت کے خوف سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دونوں کاتبوں نے پرانی طرز کا خفی نسخ خط استعمال کیا ہے۔

نسخۂ تاشقند کی املائی خصوصیات پر بات کرنا اس کے مرتّب محمد امین اف کا کام تھا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں فارسی الفاظ کے حوالے سے ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قدیم فارسی میں ''زبان'' کے لیے لفظ ''زفان'' بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ برصغیر میں ایک قدیم فارسی فرہنگ زفان گویا (زفان گویان وجہان پویان) تصنیف بدرالدین بن ابراہیم موجود ہے۔ مطلع میں یہ لفظ کئی بار مصنف نے استعمال کیا ہے۔ کاتب نے بعض جگہ تو اس کا املا زفان ہی لکھا ہے لیکن کم از کم ایک جگہ زفان کی ف کے اوپر تین نقطے ڈالے ہیں (ورق 227b سطر ۲۹)۔ ف کے اوپر تین نقطوں کا استعمال لفظ ''فزایم'' میں بھی ہوا ہے (ورق 303a سطر ۲۲)۔ اس طرح ایک جگہ لفظ 'ژی' آیا ہے چوژی وی آمد و چون قلب نام او حالم (ورق 303a سطر ۲۱)۔

نسخۂ تاشقند میں ایک دل چسپ امر یہ ہے کہ اس کے ہر ورق پر نسخہ وقف کرنے والے کی مہر ثبت ہے جس کا سجع بحر مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) میں ہے:

نمود این نسخہ وقفِ بی ریا خاقانِ دین پرور بروحِ والدِ خود حضرتِ سلطان ا میر حیدر

مُہر کی قرائت کے لیے اپنے ایرانی دوست محمد جواد جدّی کا ممنون ہوں۔

ہمیں سلطان امیر حیدر کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ نسخہ چونکہ ماوراءالنہری ہے، قیاس ہے کہ سلطان بھی وہیں کے ہوں گے۔ مہر زیادہ پرانی نہیں ہے۔ خانات بخارا میں منغیت حکمرانوں میں ایک نام سید حیدر تورہ (حکومت: ۱۲۱۵-۱۲۴۲ھ/۱۸۰۰-۱۸۲۶ء) ملتا ہے۔ نسخہ کے ابتدائی دو صفحات پر پرانے مالکوں کی یادداشتیں اور مہریں ہیں۔ ۹۵۰ھ میں یہ نسخہ احمد بن میرزا خواجگی کی ملکیت میں تھا۔ قاضی محمد ظریف نے یہ نسخہ حضرت ایشان عبداللہ خواجہ بن حضرت مولانا محمد شریف سے خریدا تھا۔ یہ سب ماوراءالنہری لوگ ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ شروع ہی سے ماوراءالنہر میں گردش کرتا رہا ہے اور اس علاقے سے باہر نہیں نکلا۔

**فہرست مضامین:** راقم السطور نے نسخہ ہائے تاشقند و رام پور کو سامنے رکھ کر اس کے محتویات اور مندرجات کی ایک تقابلی فہرست تیار کی ہے جس سے نہ صرف اس کتاب کے کل مضامین (مطابق نسخۂ تاشقند) معلوم ہوجاتے ہیں بلکہ نسخۂ رام پور کے نواقص بھی واضح ہوگئے ہیں۔ دیکھیے: ضمیمہ فہرست مضامین۔

**مطلع النجوم و مجمع العلوم فارسی ادب کا گنجینہ:** یہ کتاب اپنے نام کی طرح، اپنے دور کے متداولہ علوم وفنون کا دائرۂ معارف ہے۔ اس میں مختلف علوم وفنون پر ۷۵ مقالات یا مباحث (قدما کی اصطلاح میں ''کتاب''، جدید اصطلاح میں ''باب'') درج ہوئے ہیں۔ کچھ ابواب میں من وعن بعض قدیم عربی رسائل کا پورا متن نقل کردیا گیا ہے۔ عربی ادبیات کے لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلّم ہے، تاہم میری دل چسپی اس کتاب میں ''فارسیات'' سے ہے۔ مصنف نے جا بجا فارسی اشعار نقل کیے ہیں، بعض مقامات پر عربی عبارتوں کی ترجمانی فارسی نثر میں کی ہے اور بعض جگہوں پر مستقل بالذات فارسی نثر لکھی ہے۔ مصنف کا زمانۂ حیات دیکھتے ہوئے، یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مطلع میں فارسی زبان میں جو کچھ نقل ہوا ہے وہ فارسی ادب کے اوّلین اور قدیم ترین نمونوں میں سے ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مطلع کے ذریعے ہمیں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری یا اس سے ماقبل فارسی نثر و نظم کا ایک عظیم خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اگر کوئی باذوق محقق مطلع سے صرف ''فارسیات'' نکال کر، الگ سے ایک کتاب تالیف کرے تو میرے خیال میں بذات خود یہ فارسی نثر و نظم کا ایک گراں قدر مجموعہ ہوگا۔ میں مطلع کو ایک ایسے سمندر سے تشبیہ دیتا ہوں جس کی تہہ میں بہت سے قیمتی موتی ہیں۔ اگر کوئی ماہر غواص غوطہ زنی کرے تو وہ اس کی تہہ سے گراں بہا موتی نکال کر لاسکتا ہے۔

میں نے یہاں مطلع سے فارسی نثر اور نظم کے چند نمونے جمع کیے ہیں۔ نسخۂ تاشقند اگرچہ نسخۂ رام پور کے مقابلے میں بہت صاف ہے لیکن اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ بالخصوص فارسی اشعار پڑھتے ہوئے اس طرف توجہ گئی ہے اور انھیں بڑی محنت سے اس قابل بنایا ہے کہ ان اشعار میں وزن اور عروض کے مسائل کم سے کم تر نظر آئیں۔ بعض جگہ کھڑے بریکٹ [] میں اپنے طرف سے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ عربی عبارات اور اشعار کا کیا حال ہے؟ میں فارسی اشعار کی قرائت میں معاونت کے لیے اپنے ایرانی دوست امید شاہمرادی (ریسرچ اسکالر دانشگاہ فردوسی، مشہد) کا سپاس گزار ہوں۔

**فارسی نثر کے نمونے:** عرشی صاحب نے نسفی سے منسوب ایک رسالہ طلبۃ الطلبہ سے عربی کے بعض نادر فارسی مترادفات دیے ہیں۔ وہ محض نمونہ مشتے از خروار ہے۔ مطلع میں متعدد مقامات پر عربی عبارات لکھ کر فارسی ترجمانی کی گئی ہے۔ ایسے مقامات کو سامنے رکھ کر ہم عربی کے فارسی مترادفات کی ایک طویل اور بہتر فہرست/فرہنگ تیار کر سکتے ہیں۔ اگرچہ نسفی کی تفسیر قرآن مجید اور کچھ چھوٹی فارسی تصانیف بھی دستیاب ہیں جیسے عقائد نسفی اور رسالہ در تصوّف و اہل تصوّف (۷)، لیکن مطلع کی شان دوسری ہے اور میرے خیال میں یہ ایک موثق سند ہے۔ مطلع میں فارسی الفاظ کی قدیم شکلیں استعمال ہوئی ہیں جیسے مندرجہ ذیل اقتباس میں "زبان" اور "زفان" دونوں دیکھے جا سکتے ہیں:

"اقرار بہ زبان با تصدیق دل مر خدای را عزّوجل بہ ہستی ایمان است و اقرار بہ زفان با تصدیق دل مر خدای را عزّوجل بہ بی کسی توحید است و اقرار بہ زفان با تصدیق دل مر خدای را عزّوجل بہ بی خوفی معرفت است و پذرفتن امر و تسلیم حکم اسلام است واین ہر چہار بہ جملگی دین است۔"(4a)

نسفی نے ایک جگہ شیخ امام ابوالحسن علی بن محمد بن الحسن الحاتمی البلخی کا قول فارسی میں نقل کیا ہے اور پھر اس کی تفسیر فارسی میں بیان کی ہے۔ حاتمی کا قول یہ ہے:

"بہ ہمہ صفت ہا[ی] خدا عزّوجل بگرو و استوار دار، ازلی و ابدی، و کیفیت مجوی، و ہمہ کارہا را بہ قضا و مشیت و تقدیر خدای عزوجل بین و [از] جہد بندگی دست باز مدار و بہ ہمہ جہدہا بکوش و توفیق و عصمت از خدای عزّوجل بین و ہمہ یاران پیامبر را دوست دار و اندر اہل بیت طعن مکن و ہمہ اہل بیت را دوست دار و اندر یاران طعن مکن و ہر چند نیک باشی از خدای عزّوجل بترس و ہر چند بد باشی از خدای عزّوجل نومید مباش۔ ہر کہ بدین ہست، مسلہ اعتقاد پاک دارد، وی از جملہ سُنیان بود۔"(5a)

نسفی نے امام ابی القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری کا عربی رسالہ منثور الخطاب فی مشہور الابواب (اربع رسائل فی التصوف، قشیری، بہ اہتمام قاسم سامرائی، مجمع العلمی العراقی، بغداد، ۱۹۶۹ء میں شامل ہے) خود فارسی میں ترجمہ کیا ہے (و ترجمتہا منی) یہاں چند اقوال درج کیے جاتے ہیں:

توبہ چیست؟ پشیمانی بر کردہ بہ نادانی۔

زُھد چیست؟ ماندن فزونی وجُود بزودی۔

[الاستقامت] استادن بی برگشتن ویکسان بودن بی دگرگشتن۔

[تصوف] صوفی گری وفاست بہ عہو دوفنا از ہر معہود۔

[شوق] خوش دل بندہ درطلب دیدار آفرینندہ۔

مشاہدہ چیست؟ بینایی بی کجایی۔ (6b-9b)

نسفی نے کتاب تذکرہ اصول التذکیر وتبصرہ وجوہ التقدیر میں سب سے زیادہ فارسی نویسی کی ہے۔اس کی "مجلس فی کلمہ لا الہ الا اللہ" میں لفظ "ھو" پر پہلے عربی میں اور پھر فارسی میں بیان درج کیا ہے۔ فارسی حصہ سے ملخص اقتباس ملاحظہ ہو:

"ھو دو گروہ گویند۔ مستان گویند ودوستان۔ مستان گویند نیم شبان گویند ہو، طوفان لعنت برایشان باران شود؛ دوستان درسحرگان گویند ہو، رحمت نثار ایشان شود۔ نہ ہرکہ ہو گوید ہو را شناسد، نہ ہرکہ آتش بہ نام آرد زفانش سوزد؛ نہ ہرکہ مشک برزفان راند بُوی مشک یابد؛ نہ ہرکہ گوید مالش (؟) بازار شود؛ نہ ہرکہ ہو گوید دلش شوران شود؛ نہ ہرکہ ہو گوید پرس جویان شود؛ نہ ہرکہ گوید معنی ہو داند؛ نہ ہر گوید لذت وحلاوت ہو یابد۔ ہو دو حرف است وحق را دوم نیست............۔

ودر حکایت آمدہ است از شبلی رحمۃ اللہ کہ گفت وقتی سیاحت می کردم وبہ دوستان حق می رسیدم، ہیچ دوست بدان صفت نیافتم کہ آن را۔ گفتند چگونہ بود وکجا بود؟ گفت جوانی دیدم برلب دریا، دل درتفکر داد وسر بہ تحیّر دادہ۔ سلام گفتم۔ گفت: ہو؛ گفتم طعام بایدت؟ گفت: ہو؛ گفتم شراب بایدت؟ گفت: ہو؛ گفتم لباس بایدت؟ گفت: ہو ہو؛ گفتم جویانِ کی؟ گفت: ہو؛ گفتم درشوقِ کی؟ گفت: ہو ہو ہو ہو۔ چندان بگفت کہ نفسش گسستہ شد واز جان بی جان وبہ دوست پیوستہ شد۔" (227b-228a)

اسی باب کی مجلس فی الحج میں امام زین العابدین کے واقعہ حج بیت اللہ کو جو عربی کتب میں تو مذکور ہے، یہاں شیریں فارسی میں بیان کیا گیا ہے:

"علی بن الحسین بن علی زین العابدین لبی طواف کعبہ می کرد ومی گفت باخدا در

سجدہ: ''عبدک بفنائک، مسکینک بفنائک'' و گریست و می زارید۔ بینندہ ای ورا گفت: ای قرۂ عین مصطفی و دل و دیدۂ مرتضی و چراغ و شمع زہرا! ترا باری چندین چرا باید گریستن؟ گفت: خاموش کہ درین درگاہ خویشتن بینان را [بار] نیست۔ خانہ ای کہ از ہزار فرسنگ و زیادت بہ سوی وی می دوند و فرزند حسین یتیم و اہل حسین و خویشان، چو مصیبت زدگان شدہ، خان و مان ویران شدہ، با مان بسیار چون درویشان زار وار گرسنہ و خستہ و برہنہ ماندہ در بادیہ نشستہ و بوستان ہا خرّم ماندہ، بسترشان دیگ جوشان، بالینشان خار مغیلان، خانشان سایۂ میل، مرکبشان ریگ ہبیل، طعامشان عطام [کذا: شاید حطام]، شرابشان سراب، لباسشان پلاس، طبّاخشان آفتاب، چراغشان ماہتاب، محملشان منزل، ساق ہاشان آماسیدہ، پایہاشان طرفیدہ، مویہا بالیدہ، روی رنگ گردانیدہ، کتف ہاشان عریان، دلہاش بریان، چشمشان گریان، شب در شفت و تعب، روز در رنج عرب، راہبر ایشان قافلہ، قدم ہای ایشان آبلہ، سامعہ شان نالۂ ناقہ، ساقشان متابع ساقہ، نہ در چشم خواب، نہ در کوزہ آب، نہ در فزود زاد، نہ در بادیہ باد، نہ با رفیق رفق، نہ با دلیل دل، نہ از سرما آسایش، نہ از گرما رہایش، بہ بُویا بہ دل پویان [کذا: نسخہ رام پور: بہ قدم پویان نہ دل پویان؟]، رخ بہ آبِ دیدہ شویا[ن]، بہ زبان لبیک گویان خدای کعبہ را جویان۔ تا با چندین رنج از بادیہ نگردی عرفات و منا نیابی، تا از صراط و ہاویہ نگردی جنّات ماوی نیابی، تا محنت و بلیّت کونین نکشی دیدار مولی نیابی۔

ای رنج و عنای حاجیان از پی تو | بگذاشتہ جملہ خان و مان از پی تو
پای آبلہ در ریگ روان از پی تو | در سایۂ میل دادہ جان از پی تو''

(243a-243b)

اسی باب میں رمضان کی تعریف میں یہ فارسی عبارت ہے:

''بزرگان این ماہ را بہ بہار خندان مانند کردہ اند۔ چون بہار ابر در ہوا بیند؟ باران فرو[د] بارَد، نبات ہا بر رویانَد، سبزہ بدَمانَد، گل ہا بشکفانَد، صحرا بساط عبقری گسترد، کوہ را حلۂ رنگین در سر کشَد، درختان عقد ہای مروارید بر بندد، ہمچنین چون ماہ رمضان درآید

مسجد ہا منور گردد، دل ہا بہ نشاط آید، قندیل ہا بفروزند، مسجد روشن کنند، جماعت ہا انبوہ شود، مجلس ہا ساختہ شود، عاصیان بہ راہ آیند، گریختگا[ن] بہ درگاہ آیند، گناہ کاران بر خویش بگریند، فاسقان از کردہ توبہ کنند، جوانان از دیدہ اشک بارند، پیرانِ مُوسپید [سر] درخاک مالند، خایفان در ہرب آیند، راجیان درطلب آیند، عارفان درطرب آیند، مشتاقان درشغب آیند۔ ای مومنان ماہ رمضان موسم مطیعان آمد، شفیع عاصیان آمد، میزبان درویشان آمد، پای مردحق شناسان آمد، روز بازار گناہ کاران آمد، ای رنجوران وقت [راحت] آمد، ای گناہ کاران وقتِ توبہ آمد، ای جوانان وقتِ حرمت آمد، ای پیران وقتِ ندامت آمد، ای در[د]مندان وقتِ دعوت آمد، ای عاصیان موسم رحمت آمد، ای عارفان ہنگام خلوت آمد۔'' (250a-250b)

مطلع کے باب فصول المشاہد لحصول المقاصد میں بھی فارسی نثر اور نظم کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ یہ طبع تاشقند میں 264a تا 268b ہے۔

کتاب ایراد الاوراد دعوات الصباح والمساء میں متعدد عربی اور فارسی دعائیں درج کی ہیں۔ ایک فارسی دعا کا نمونہ:

''خواجہ امام ابوالقاسم حکیم را گفتند شاید از خدای عزوجل عروس شایستہ خواستن؟ گفت: شاید۔ گفتند: چگونہ باید خواستن؟ گفت: گوید ای بارخدای روزی کن مراجفتِ شایستہ وبایستہ، بامال وجمال، بادیانت، باصیانت، باعفّت، با قناعت، کہ ازتو بترسد واز خلق شرم دارد ومرا دوست دارد۔'' (325a)

اسی باب میں مصنف نے ایک دعا خواجہ ابوالعباس چغانی سے نقل کی ہے۔ اس میں لفظ ''امروزینہ'' کی تکرار کی ہے جو آج (Today) کے مفہوم میں ہے۔ خواندنی ہای امروزینہ من، کارہای امروزینہ من، محنت ہای امروزینہ من، طاعت ہای امروزینہ من (325a)۔ قدیم فارسی میں لفظ ''دینہ'' گذرے ہوئے کل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

**فارسی اشعار:** ویسے تو مطلع میں کئی مقامات پر فارسی اشعار نقل ہوئے ہیں، لیکن زیادہ تر فارسی اشعار کتاب الصناعات والابداعات میں ملتے ہیں، جہاں مصنف نے شعری صنایع بدایع کا ذکر کیا ہے

اورشواہد کے طور پر عربی اور فارسی اشعار پیش کیے ہیں۔ یہ باب طبع تاشقند میں ورق 293a تا 304a ہے۔یہی وہ باب ہے جسے فارسی شاعری کے قدیم ترین نمونوں کا خزانہ کہنا چاہیے۔عرشی صاحب نے بھی زیادہ تر اسی باب سے اشعار نقل کیے ہیں۔مصنف نے کہیں قائل کا نام لکھا ہے،کہیں نہیں لکھا اور فارسی اشعار ''بالفارسیہ'' یا ''لبعض شعراء العجم'' یا ''قول الشاعر'' لکھ کر نقل کیے ہیں۔عرشی صاحب فارسی ادب کے حوالے سے مطلع کی اہمیت سے خوب آگاہ تھے،اسی لیے اپنے مقالے کی دوسری قسط (اپریل ۱۹۴۶ء) پوری کی پوری اسی موضوع پر مختص کردی اور ''فارسی گوشعرا'' کا عنوان باندھ کر دقیقی، عمارہ،عنصری،قمری،آغچی ،شطرنجی،مسعودلاہوری،اختری،برہانی،جیلی،عبدالصمد،نظری (نسخۂ تاشقند: نظرزی) اور خود نسفی کے اشعار کا ایک انتخاب مطلع سے دیا ہے۔

نسفی کے زمانۂ حیات سے ماقبل مشہور شعرا کے دواوین شائع ہوچکے ہیں،تاہم گمنام یا بے نام شعرا کا معاملہ دوسرا ہے جن کے پورے دواوین نہیں بلکہ متفرق اشعار ملتے ہیں۔اس کے لیے پانچویں صدی ہجری کے مصنف محمد بن عمرالرادویانی کی ترجمان البلاغہ (بہ تصحیح وتحقیق احمد آتش، بہ کوشش توفیق سبحانی واسماعیل حاکمی ،انجمن آثار ومفاخر فرہنگی،تہران،۱۳۸۰ش) بہت عمدہ مأخذ ہے۔معاصر محققین نے بھی قدیم شعراء کے متفرق اشعار کو بڑے اہتمام سے جمع کیا ہے۔یہاں اس نوعیت کی سب کتابوں کا ذکر تو ممکن نہیں ہے لیکن چند ایک کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہے:

اشعار پراکندۂ قدیمترین شعرای فارسی زبان از حنظلہ بادغیسی تا دقیقی (بغیر رودکی)، تصحیح و کوشش ژیلبر لازار،تہران،۱۳۶۱ش۔

شاعران بی دیوان،تالیف وتصحیح محمود مدبری،تہران،۱۳۷۰ش۔

اشعار فارسی پراکندہ درمتون (تا سال ۷۰۰ ہجری) تالیف وتصحیح علی صفری آق قلعہ،تہران، ۱۳۹۶ش،۲ جلد۔

ان تینوں کتب کے مرتبین نے مطلع النجوم نہیں دیکھی۔محمود مدبری کی کتاب میں ہمیں مطلع النجوم کے تین جگہ حوالے ملتے ہیں جس کے لیے وہ ایرج افشار کے ایک مقالے (مطلع النجوم،مجلہ آیندہ،تہران، ۱۳۶۲ش،شمارہ ۳و۴) کا حوالہ دیتے ہیں (ص ۵۳۹)۔یہی حوالہ ہے محمد امین اف نے بھی اپنے مقدمے میں استعمال کیا ہے۔ایرج افشار کا ماخذ عرشی صاحب کا مقالہ تھا،اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ (باقی)

# حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سے منسوب نوزدہ مکتوبات کی حقیقت

ڈاکٹر غلام قادر لون

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (المتوفی ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۵ء) ایک کامیاب مبلغ اور عالم وداعی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ ایک کثیر التصانیف صاحب قلم بھی تھے۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کی تصانیف کی تعداد ۱۴۵ اور ۱۷۰ تک بتائی ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض تصانیف ان سے غلط طور پر منسوب ہیں۔ نیز اس کی متعدد مثالیں ہیں کہ ایک ہی تصنیف کئی ناموں سے معروف ہے۔ ان کے مکتوبات کا حال اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔

مکتوبات میر سید علی ہمدانیؒ کی صحیح تعداد کیا ہے اس بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔ بعض خطی نسخوں میں مکتوبات کی تعداد اٹھارہ آئی ہے۔ جن میں ان کے سولہ خطوط فارسی میں ہیں۔ ایک خط مولانا جعفر بدخشی کی طرف سے ان کی خدمت میں بھیجا گیا جس کا جواب انہوں نے بھی عربی ہی میں لکھا ہے۔ ان اٹھارہ مکتوبات کے علاوہ بعض نسخوں میں ایک تعارفی رقعہ ہے جو ایک امیر کے نام بھیجا گیا ہے۔ ایک طویل مکتوب رسالہ ''بہرام شاہیہ'' یا ''صلاتیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محمد شاہ بن بہرام شاہ کے نام ہے۔ ''رسالہ داؤدیہ'' بھی ایک مکتوب ہے یعنی کل اکیس مکتوبات میں بیس امیر صاحب کے ہیں۔

یہ تمام خطوط وہ خطی اور مطبوعہ نسخوں میں موجود ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ المکتوبات الفارسیۃ الامیریہ: نسخہ رضا لائبریری رامپور زیر اندراج نمبر ۲۳۷۷۔ اس نسخہ میں حضرت میر سید علی ہمدانی کے سترہ خطوط فارسی میں اور ایک عربی میں ہے۔ مکتوبات کے علاوہ اس میں رسالہ داؤدیہ بھی ہے جس کے آخر میں سنہ کتابت ۹۵۱ھ مرقوم ہے۔

---

حدی پورہ رفیع آباد کشمیر۔

ب۔رسالہ مکتوبات من تصانیف سید علی الہمدانی۔ریسرچ لائبریری حضرت بل سرینگر کا یہ نسخہ زیر اندراج نمبر ۱۹۶۶، اٹھارہ مکتوبات پر مشتمل ہے۔

ج۔مکتوبات امام حقانی۔اس مطبوعہ نسخے میں متذکرہ بالا نسخوں کے ۱۸ر مکتوبات کا فارسی متن چھپا ہے۔

د۔مکتوبات میر سید علی ہمدانی مرتبہ ومترجمہ پروفیسر عبدالقیوم رفیقی۔اس میں ۱۸ر مکتوبات کا متن ہے۔

ھ۔مکتوبات حضرت امیر کبیر، مرتبہ حافظ محمد حسن گاڈیاری۔سرینگر کے اس مطبوعہ نسخے میں بھی مذکورہ بالا ۱۸ مکتوبات ہیں۔

و۔تلنگانہ اسٹیٹ گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے کتب خانہ میں کتاب نمبر ۲۸۸۰ (جدید) کے تحت موجود 'مکتوب میر سید علی ہمدانی' نامی کتابچہ میں صرف ایک مکتوب ہے۔

ز۔تلنگانہ اسٹیٹ گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد میں کتاب نمبر ۱۸۵۹ موسوم بمجموعہ ''رسائل تصوف وسلوک'' میں حضرت شاہ ہمدان کے چھ مکتوبات کا متن ہے۔

ح۔مکتوبات مع رسائل۔اس مطبوعہ نسخہ کے حصہ سوم میں ایک سفارشی رقعہ اور ایک طویل مکتوب ہے۔

ط۔حضرت شاہ ہمدان کے چار خطوط۔چند بادشاہوں کے نام از ڈاکٹر شمس الدین احمد۔اس میں چار مکتوبات کا متن ہے۔

ی۔مکتوبات میر سید علی ہمدانی (ا) مرتبہ ڈاکٹر محمد ریاض خان۔اسے اقبال اکادمی لاہور پاکستان نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔اس میں ۱۹ مکتوبات ہیں۔اس میں مولانا جعفر بدخشی کا عربی مکتوب اور اس کے جواب میں میر صاحب کا عربی خط شامل نہیں ہے۔فاضل مرتب نے فارسی متن کی تصحیح مندرجہ ذیل نسخوں سے کی ہے:

ا۔نسخہ کتاب خانہ ایاصوفیہ استانبول جو ۸۱۴ھ میں رقم کیا گیا ہے۔اور جس کی نقل مرکزی

کتاب خانہ دانش گاہ تہران شمارہ ۵ / ۲۷۶ میں ہے۔اس میں ۱۹؍مکتوبات ہیں۔

۲۔پیرس کی قومی لائبریری میں شمارہ ۱۶۶۶ کی نقل جو مرکزی دانش گاہ تہران میں موجود ہے۔اس میں ۴ مکتوبات ہیں۔

۳۔نسخہ خطی کتاب خانہ ملک تہران مرقوم سال ۹۰۷ھ شمارہ ۴۲۷۴ کے ساتھ منسلک ہے۔ اس میں ۵ مکتوب ہیں۔

نسخہ ۲؍اور نسخہ ۳ کے نو مکتوب نسخہ ا؍میں موجود ہیں۔

متذکرہ بالا مکتوبات کے اردو اور انگریزی ترجموں کی تفصیل یہ ہے:۔

ک۔امام حقانی از مولانا غلام مصطفٰی اندرابی۔۱۸؍مکتوبات کا اردو ترجمہ ہے۔

ل۔مکتوبات حصہ دوم و حصہ سوم۔ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم۔۱۸؍مکتوبات کا اردو ترجمہ ہے۔

م۔حضرت شاہ ہمدان کے چار خطوط۔چند بادشاہوں کے نام از ڈاکٹر شمس الدین احمد۔ چار مکتوبات کا اردو ترجمہ ہے۔

ن۔مکتوبات میر سید علی ہمدانی۔مرتبہ و مترجمہ پروفیسر عبد القیوم رفیقی۔۱۸؍مکتوبات کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ان تمام خطی،مطبوعہ نسخوں اور اردو،انگریزی ترجموں میں وہ مکتوبات ہیں جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔یہ اکیس ہیں۔

مکتوبات کے بعض خطی اور مطبوعہ نسخوں میں مختلف عنوانات کے تحت انیس مکتوبات ہیں۔ ان کے اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔یہ مکتوبات بھی حضرت میر سید علی ہمدانی سے منسوب ہیں۔جن خطی مطبوعہ نسخوں اور ترجموں میں یہ انیس مکتوبات موجود ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :

س۔نوزدہ مکتوب مرغوب مطلوب از تصنیف قدوۃ الواصلین امام العارفین حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی: مخطوطہ مملوکہ علامہ اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر زیر اندراج نمبر ۶۵۹۰،سنہ ۱۰۶۱ھ/۱۱۶۱ھ میں تحریر کیا گیا ہے۔

ع۔مخطوط مملوکہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ،کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر زیر اندراج نمبر ۲۶۹ سنہ ۱۳۱۵ھ میں نقل کیا گیا ہے۔اس میں انیس مکتوبات ہیں۔

ف۔نوزدہ مکتوبات مرغوب از تصنیف قدوۃ الواصلین وامام العارفین حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی: مخطوطہ مملوکہ گورنمنٹ آرکیوز لائبریری شعبہ مخطوطات زیر اندراج نمبر ۲۴۹ ہے۔اس میں انیس مکتوبات ہیں۔

ص۔مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری رامپور یوپی زیر اندراج نمبر ۸۵۵ دوسرے رسائل کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔اس میں انیس مکتوبات ہیں۔

ق۔مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲،مرتبہ ڈاکٹر محمد ریاض خان۔نسخہ ق کے ''مکتوبات میر سید علی ہمدانی'' کا دوسرا حصہ ہے۔ڈاکٹر محمد ریاض خان صاحب نے ان ۱۹ رمکتوبات میر کا تذکرہ کیا ہے اور جن کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔فاضل مرتب کا بیان ہے کہ انھوں نے ان مکتوبات میں سے بارہ مکتوبات کا متن حیدر بدخشی کی تصنیف 'رسالہ مستورات' (منقبۃ الجواہر) کے دو خطی نسخوں (کتاب خانہ ملی فرہنگ تہران اور کتاب خانہ خانقاہ احمدی تہران کے نسخوں) کے آخر میں پایا ہے۔ان کے بقول ان ۱۲ رمکتوبات کا متن (شمارہ ۸ تا ۹) در مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ان کے اردو ترجموں سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ان میں سے ایک ترجمہ ملک فضل الدین ککئی زئی نے کیا ہے اور دوسرا ترجمہ ماہنامہ 'ادبی دنیا' (اردو) لاہور کے مدیر محمد عبداللہ قریشی نے ڈاکٹر محمد ریاض کو ہدیہ کیا ہے۔فاضل مرتب نے اس کے مترجم کا نام نہیں دیا ہے۔ان کا بیان ہے کہ انہیں سات مکتوبات کا متن نہیں ملا ہے کیونکہ ان کا متن مفقود ہے۔ان کے بیان کے مطابق اردو ترجمے کی روشنی میں مفقود المتن مکتوبات (شمارہ ۱ تا ۷ در مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲) کے عنوانات یوں نظر آتے ہیں:

۱۔در اقسام مخلوقات ۲۔در بیان موجودات ۳۔در طلب علم ۴۔در بیان تجرید وتفرید ۵۔در عشق ومحبت ۶۔در اوصاف روح ۷۔در نزول بلا،ان سات کو چھوڑ کر فاضل مرتب نے بارہ مکتوبات کا متن دیا ہے۔

فاضل مرتب نے جن سات مکتوبات کے بارے میں کہا ہے کہ ان کا متن مفقود ہے۔ان کا متن اوپر دیے گئے چار نسخوں س ع ف ص میں دیا گیا ہے۔ان چاروں نسخوں میں انیس مکتوبات کا متن یکساں ترتیب سے مرقوم ہے۔غالباً فاضل مرتب کی ان نسخوں تک رسائی نہیں ہوئی۔

نوزدہ مکتوبات کے جو اردو ترجمے ہمارے پیش نظر رہے ہیں۔ان کی تفصیل یہ ہے:

ر۔اردو ترجمہ کتاب مکتوب حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ۔مترجمہ ملک فضل الدین مرحوم ککی زئی لاہور باردوم اس میں ان انیس مکتوبات کا ترجمہ ہے جن کا تذکرہ ڈاکٹر محمد ریاض خان نے کیا ہے۔

ش۔مکتوبات از تصنیف قدوۃ الواصلین، امام العارفین، امام الہمام، ملک العلماء الاعلام، قطب ربانی، غوث صمدانی محبوب سبحانی، علی ثانی، شاہ ہمدان جناب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ قدس سرہ اردو ترجمہ جناب مولوی محمد ابراہیم حصہ اول، سرینگر ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، اس میں انیس مکتوبات کا ترجمہ ہے۔

'ا' سے لے کر 'ن' تک کے نسخوں میں جن مکتوبات کا متن یا ترجمہ ہے، ان پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔یہ تمام مکتوبات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

'س' سے لے کر 'ش' تک کے نسخوں میں جو انیس مکتوبات منقول ہیں یہاں انہیں مکتوبات سے بحث ہے۔ان مکتوبات کے عنوانات یہ ہیں:

مکتوب اول در اقسام عالم۔مکتوب دویم در بیان موجودات۔مکتوب سیوم در طلب علم۔ مکتوب چہارم در بیان تجرید و تفرید۔مکتوب پنجم در بیان عشق و محبت۔مکتوب ششم در اوصاف جاں۔ مکتوب ہفتم در نزول بلا۔مکتوب ہشتم در وصول۔مکتوب نہم در تصفیہ باطن۔مکتوب دہم در بلا و رضا۔ مکتوب یازدہم در شریعت و طریقت و حقیقت۔مکتوب دوازدہم در استقامت۔مکتوب سیزدہم در عیبہای دنیا و بلاہائی او۔مکتوب چہاردہم درمیان آں کہ عقل علت معرفت نیست۔مکتوب پانزدہم در ترک دنیا۔مکتوب شانزدہم در توبہ۔مکتوب ہفت دہم در نیت۔مکتوب ہژدہم در بندگی۔مکتوب نوزدہم در افعال و احکام خداوند تعالیٰ۔

یہ تمام مکتوبات میر صاحب کے نام سے منسوب ہیں اور مذکورہ بالا ترتیب سے تمام خطی نسخوں میں مرقوم اور ترجموں میں شایع ہوئے ہیں۔مگر معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب سے ان کی نسبت صحیح نہیں ہے بلکہ یہ تمام انیس مکتوبات شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی یا مکتوب جوابی میں موجود ہیں۔جو خطی اور مطبوعہ صورتوں میں مختلف لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔

یہ صرف حضرت میر سید علی ہمدانیؒ یا حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا معاملہ نہیں ہے۔علم و دانش کی تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں کہ ایک مصنف کی تخلیق کسی دوسرے اہل قلم کے

نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ یا ایک فن کار کا خون جگر کسی دوسرے کی حنا میں شامل ہو گیا ہے۔ شیخ ابو سعید الخیر (المتوفی ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۹ء) ،عمر خیام (المتوفی ۵۲۶ھ/ ۱۱۳۲ء)، شیخ عطار (الشہید ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ء، حافظ شیرازی (المتوفی ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) وغیرہ کے کلام میں نہ جانے کتنے اشعار ہیں جو معرضِ التباس میں پڑے ہوئے ہیں۔ کتنی تصانیف ہیں جن کے مصنّفین کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ پرانے زمانے میں جب طباعت کے جدید وسائل ناپید تھے، ناقل کی یادداشت اور کتابت ہی فکر وخیال کی بقا کا ذریعہ تھی۔ اس زمانے میں کسی تخلیق کا غلط طور منسوب ہونا بعید از قیاس نہیں۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے زیر بحث مکتوبات اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں کہیں کہیں الفاظ کا فرق ہے۔ یا کہیں کہیں عبارت اِدھر سے ادھر ہوگئی ہے۔ یا کہیں کوئی واقعہ چھوٹ گیا ہے۔ مگر الفاظ کا فرق، عبارتوں کا ہیر پھیر یا کسی واقعہ کا چھوٹ جانا حضرت امیر کے زیر بحث مکتوبات کے خطی نسخوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر حضرت امیر سے منسوب مکتوب میں حضرت منیریؒ کے مکتوب کی کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے یا حضرت امیر سے منسوب مکتوب میں حضرت منیریؒ کے دو تین مکتوبات کی عبارت نقل کی گئی ہے۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے زیر بحث مکتوبات اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا جائزہ لینے اور دونوں کا موازنہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ سے منسوب مکتوبات اصل میں حضرت منیریؒ کے مکتوبات ہیں۔

آیات، احادیث، اشعار، امثال، واقعات اور اعلام کا جو مواد حضرت امیر سے منسوب مکتوبات میں آیا ہے وہ سارا حضرت منیریؒ کے مکتوبات میں موجود ہے۔ الفاظ وعبارات بھی دونوں میں یکساں ہیں۔ حضرت امیر کے مکتوبات میں ''مرسل الیہم'' کے نام نہیں ہیں۔ جبکہ شیخ منیریؒ کے مکتوبات میں ''مرسل الیہم'' کے نام آئے ہیں۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ سے منسوب مکتوبات اور حضرت منیریؒ کے مکتوبات میں ہم ذیل میں چند مکتوبات سے تین تین مثالیں پیش کریں گے:

## نوزدہ مکتوب مرغوب از تصنیف قدوۃ الواصلین

### وامام العارفین حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی قدس اللہ

خدایا رحمتت دریای عام است ازانجا قطرۂ مارا تمام است
اگر آلائش خلق گنہ گار بداں دریا فروشوی بیکبار
نگر دو تیرہ آں دریا زمانے ولے روشن شود کار جہانی (۱)

مکتوب صدی مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ

مناجات

خدایا رحمتت دریاء عامست وازانجا قطرۂ مارا تمام است
اگر آلائش خلق گنہ گار بداں دریا فروشوی بیکبار
نگر دو تیرہ آں دریا زمانی ولی روشن شود کار جہانی (۲)

**مکتوب اول دراقسام عالم:** ای برادر برحکم حدیث مردم ہمہ برسہ قسم اند، قسمی مشابہ بہایم اند ہمت ایشاں براکل وشرب ونوم ومباشرت است......الخ (۳)۔

**مکتوبات دوصدی مکتوب ہفتم درہمت بلند، الخ:** برادر شیخ عم سلام ودعا ازشرف منیری مخصوص است، اے برادر برحکم حدیث مرداں ہمہ برسہ قسم اند، قسمی برمشابہت بہایم اند ہمت ایشاں اکل وشرب ونوم ومباشرت است......الخ (۴)۔

صاحب خبراں کہ عالم دل داراند درنکتہ غیب محرم اسرار اند
در آئینہ صفائی شاں زنگی نیست زانروے زنقش دوں حق بیزارند (۵)

رباعی

صاحب خبراں کہ عالم دل دارند در نکتہ غیب محرم اسرارند
در آئینہ صفائی شاں زنگی نیست زاں روکہ زنقش دوں حق بیزارند(۶)

خواجہ بایزید رحمۃ اللہ گویدسی سال میگفتم خدایا چنیں کن وچناں کن چون باول منزل معرفت رسیدم گفتم تو مراباش وہ ہرچہ خواہی آں کن ہر کراحاجت بدوست از وبخواہدوہ ہر کراحاجت خوداوست ازوچہ خواہد۔(۷)

خواجہ بایزید قدس اللہ سرہ العزیز گفت سی سال میگفتم، چنین و چناں کن وچوں باول قدم معرفت رسیدم گفتم خدایا تو مراباش و ہرچہ خواہی کن ہر کراحاجت بدوست ازوبخواہد و ہر کراحاجت خود

اوست از وچہ خواہد۔(۸)

**مکتوب دوم در بیان موجودات:** پس موجودات محسوسہ را عالم ملک گوئند و موجودات معقولہ را عالم ملکوت گویند و موجودات بالقوۃ را عالم جبروت گویند و ہرچہ ورای اینست عالم لاہوت گویند و لطافت عالم ملک ہیچ نسبت ندارد با لطافت عالم ملکوت۔(۹)

**مکتوب صد و یکم شمہ از علم مکاشفات:** ............اما ایں مقدارے کہ نویسند اینست موجودات محسوس را عالم ملک میگویند و موجودات معقول را عالم ملکوت میگویند موجودات بالقوۃ را عالم جبروت میگونید و ہرچہ ماورائے اینست آں را عالم لاہوت میگویند............لطافت عالم ملک ہیچ نسبت ندارد بالطافت عالم ملکوت۔(۱۰)

کہ اہل بصیرت گفتہ اند ملک با تست و ملکوت با تست و جبروت با تست و خداوند تعالیٰ با تست از ینجا گفتہ اند کہ حقیقت انسان مظہر سر الوہیت است۔(۱۱)

وازاینجا سست کہ میگویند ملک با تُست و ملکوت با تست و جبروت با تست و خداوند جل وجلالہ با تست ازاینجاست کہ میگویند حقیقت انسانیت مظہر و آئینہ سر حقیقت الوہیت است۔(۱۲)

نیست مردم نطفہ از آ ب و خاک ہست مردم سرقدر جان پاک
صد جہان پر فرشتہ در وجود نطفۂ را کے کنند آخر سجود (۱۳)

---

نیست مردم نطفہ جز (از) آب و خاک ہست مردم سرو قدر جان پاک
صد جہان پر فرشتہ در وجود نطفۂ را کے کنند آخر سجود(۱۴)

**مکتوب سیوم، در طلب علم:** ای برادر چوں عمل بی علم ممکن نیست و وصول بمقصد جز بعمل نی پس طلب علم فریضہ بود امانہ آن علم کہ ترا بر در سلاطیں بردیا ترا قاضی و مفتی ساز د مقصود بعلم علم آخرت است و رفتن راہ حق تا در غلط نیفتی و خودرا از علمہای دنیا نگاہ داری۔(۱۵)

**مکتوب دوصدی مکتوب دوم، در طلب علم:** ای برادر چوں عمل در شرع بلا علم ہرگز ممکن نیست و ہیچ سود ندارد و وصول بمقصود جز بعمل نہ ضرورت طلب فریضہ بود۔ مثنوی.........اما نہ آں علم کہ ترا بر در سلاطین و ملوک بردو یا ترا قاضی و مفتی کند۔ علم آخرت در راہ حق میگویم تا در غلط نیفتی و خودرا از علمای دنیا نگاہ داری۔(۱۶)

ای برادر علم بسیار است، عمر کوتاہ، پس بتحصیل ہمہ علم عمر وفا نکند وفرض آں مقدار ست کہ عمل بداں درست آید۔ فرداا ز کار خواہند پرسید نہ از علم بخروار......آخر عزیزے شکایت کردہ و گفتہ اند:

| | |
|---|---|
| چو علمت ہست باعلمت عمل کن | پس از علم و عمل اسرار حل کن |
| زعلم دنیوی بہتر زخروار | ترابا علم دیں یک ذرہ کردار |
| بروکاری بکن زاں کارخامست | زعلم دین ترا حرفے تمام است (۱۷) |

**مکتوب دوصدی مکتوب چہل و پنجم، درغم دیں:** ای برادر علم بسیار است و عمر ما کوتاہ مر تحصیل ہمہ علوم راوفا نہ کند وفرض آں مقدار است کہ عمل بداں درست آید فرداا ز کار خواہند پرسید نہ از علم بخروار......

آخر شکایت ازیں گروہ است عزیزے گفتہ است:

| | |
|---|---|
| چو علمت ہست باعلمت عمل کن | پس از علم و عمل اسرار حل کن |
| زعلم دنیوی بہتر زخروار | ترابا علم دیں یک ذرہ کردار |
| بروکاری بکن زاں کارخامست | زعلم دین ترا حرفے تمام است (۱۸) |

زیرا کہ آخر زماں است خلقے پدید آمدہ اند کہ اگر زرہ ونقرہ بدست ایشاں دہند بی تامل ووزن و عیار آں بگویند چوں وزن کنند و برمحک کشند ھماں مقدار ووزن وعیار آں باشد کہ ایشان گفتہ اند و اگر از ایمان وکفر یا از طاعت ومعصیت پرسند در مانند و ہرگز ندانند کہ ایماں چہ بود وکفر چہ باشد وطاعت چیست و معصیت چہ باشد۔(۱۹)

**مکتوب دوصدی مکتوب چہل و ہفتم:** اما چوں آخر الزماں خلقے پدید آمد کہ اگر زرہ ونقرہ بدست ایشان دہند در حال بے تامل میگویند کہ وزن وے چندیں است و عیار وے چندیں است چوں وزن کنید و در محک زنید ہماں مقدار و وزن بود و ہماں مقدار عیار باشد و چوں حکمے از احکام ایمان وکفر یا از طاعت ومعصیت پرسند در مانند و ہرگز ندانند کہ ایماں چہ بود وکفر چہ باشد وطاعت چہ بود و معصیت چہ باشد۔(۲۰)

نوزدہ مکتوب اور شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کی اور مثالیں دیکھیے:

| نوزدہ مکتوب مکتوب نہم | مکتوب دوصدی مکتوب بست و دوم |
|---|---|
| در تصفیہ باطن | در تصفیہ وتزکیہ |
| ای برادر پاکیزہ گردانیدن اخلاق وتبدیل صفات مذمومہ | پاکیزہ گردانیدن اخلاق وتبدیل کردن صفات مذمومات |

مجموده روز روز مهما امکن کوشش نماید و مہمی بزرگ داند
واہمال وتغافل دراین کار روا ندارد کہ بلائی سخت درپیش است
نعوذ باللہ منہا وآں آنست کہ ہر چہ درعالم سباع ووحوش و
حیوانا تست ازآں ہر یک صفتی درآدمی ہست۔ صفت
ہر حیوانی کہ دروی غالب بود فردای قیامت حکم برآں
صفت کنند نہ بصورت (۲۱)

ای برادر بسا آدمی را بصورت سباع ووحوش بینی ودر صفت
انساں بصد خواری استادہ آب ندامت از دیدہ ہمی ریزند و
بسا سباع ووحوش را بصورت آدمیاں بینی کہ در صفت آدمیاں
درآرند باسرافرازی تمام استادہ باشند پس ایں عقبہ مشکل تر
است و کاری سخت دشوارتر۔ بزرگان گفتہ اند کہ کوہ احدرا
حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم درحق او فرمودہ است
احد جبل یحبنا ونحبہ۔ فردا پیراہن سنگی از ظاہروی برکشند و
بصورت آدمیاں در صفت صدیقاں درآرند (۲۳)

## مکتوب سیزدہم

### درعیب ہای دنیا و بلاہائی او

ای برادر عیب ہائی دنیا و بلاہای او را گر جلد ہا کسے نویسد تمام نشود
باید برقدر ضرورت قناعت کند و اگر برقدر ضرورت قناعت
نتواند کرد باید کہ برقدر حاجت قناعت کند تا از بلاہا وآفتہای
دنیا خلاص یابد و باستعداد مرگ وگور مشغول تواند شد (۲۵)

درویشے در حالت سکرات موت، گلیمے پوشیدہ داشت،
آں بیروں انداخت گفتند ایں چہ میکنی گفت چنانچہ آمدہ ام
ہمچناں روم۔ درویشی راحت تمامست واز بلا وفتنہ دنیا

مجموده روز روز مهما امکن کوشش نماید و مہمے بزرگ داند کہ
در تحت وتغافل ایں کار بلاے سخت درپیش است نعوذ
باللہ منہا وآں آنست کہ ہر چہ در عالم سباع و وحوش و
حیوانات است از ہر یکے صفتے درآدمی ہست ہر کدام کہ
غالب خواہد بود فردای قیامت حکم برآں صفت کنند نہ
بصورت (۲۲) ہمچنیں اے برادر بسا آدمی صورت بودا
مروز کہ فردا بینی درصف سباع ووحوش ایستادہ کنند و بسا
سباع ووحوش صورت را بینی امروز کہ فردا درصف آدمیاں
درآرند۔ ایں عقبہ مشکل است و کارے سخت بزرگان
گفتہ اند کہ کوہ احدرا کہ حضرت رسالت درحق وے
فرمودہ است احد جبل یحبنا ونحبہ۔
فردا پیراہن سنگی از ظاہروی برکشند و برصورت آدمی در
صفت صدیقاں بایستانند (۲۴)

## مکتوب پنجاہ وچہارم

### برقناعت برقدر ضرورت وکفایت

ای برادر عیب ہای دنیا و بلاہاوے اگر ہمہ عمر جلد ہا
کسے نویسد تمام نشود پس باید کہ اگر برقدر ضرورت
قناعت نتواند کرد باید کہ برقدر حاجت قناعت بود تا
از بلاہای دنیا وفتنہای وے خلاص یابد باستعداد مرگو
گور مشغول تواند شد (۲۶)

درویشے درحالت سکرات موت بود گلیمے بردوش داشت
آں بیروں انداخت گفتند ایں چہ میکنی گفت تا چنانکہ
آمدہ ام ہمچناں میروم درویشی راحت تمام است از بلا و

دوراست (۲۷)

## مکتوب ہفدہم

### درنیت

ای عزیز! عالم نیت بغایت دقیق ولطیف است ہر کسی بداں راہ نتواند برد ہر چہ کسے کند براندازہ نیت خود کند کہ نیت ہر کسے براندازہ ایمان او بود مقلد را براندازہ ایماں تقلیدی ومستدل را براندازہ استدلال وعارف را بر اندازہ ایماں مشاہد۔ (۲۹)

بزرگاں سلف بعضی بودند کہ ترک طاعت کردہ اند چوں ایشاں رادراں نیت نبود۔ گویند ابن سیرین نماز جنازہ شیخ حسن بصری نگذارد۔ گفت مرانیت نیست از اینجا بزرگاں میگویند باشد کہ ناکردن ایشاں بہ از کردن دیگراں باشد (۳۱)

## مکتوب نوازدہم

### درافعال واحکام خداوند تعالیٰ

وآنچہ مے گویند افعال واحکام او معلل است برغایت مصالح عباد زیرا کہ فعل خداوند کہ قادر وعلیم وحکیم است اگر خالی بود از غرض عبث گردد وآں برخداوند محالست پس باید کہ دراں فعل غرض باشد (۳۳)

ایجاد موجودات واجب الوجود راصفتے است ضروریۃ الوجود مثلاً صفتی است مراو راضرویۃ الوجود۔ چنانکہ جائز نیست مرذات واجب الوجود را کہ قدیم نباشد ہمچنین جایز نیست مرذات واجب الوجود را کہ موجد نباشد۔ پس ازقول

فتنہ اہل دنیا دوراست (۲۸)

## مکتوب سیوم

### درنیت

اما برادر در علم درنیت دقیق ولطیف است ہر کسے را بداں راہ نتواند بود (برد) ہر چہ صاحب دل کند براندازہ نیت خود کند کہ نیت ہر کسے براندازہ ایماں بود۔ مقلد را براندازہ ایماں تقلیدی ومستدل براندازہ ایمان۔ استدلالی وعارف را براندازہ ایماں مشاہدتی (۳۰)

درسلف بعضے بودہ اند کہ ترک طاعتے کردہ اند چوں ایشاں رانیت نبود۔ گویند ابن سیرین نماز جنازہ شیخ حسن بصری نکرد۔ گفت مرانیت است (نیست) اینجا بزرگان میگویند باشد کہ ناکردن ایشاں بہ از کردن دیگراں باشد (۳۲)

## مکتوب ہشتاد ودوم

درآنکہ افعال خداوند تعالیٰ واحکام ومعلول است بعلتے یا منزہ است ازیں وہر کہ میگوید کہ افعال خداوند واحکام خداوند تعالیٰ معلول است برغایت مصالح عباد زیرا کہ اگر فعل خداوند کہ قادر است وعلیم است وحکیم است خالی بود از غرض عبث بود وآں برخداوند محال پس باید کہ دراں فعل غرضے بود (۳۴)

ایجاد موجودات واجب الوجود را صفتے است ضروریۃ الوجود چنانکہ قدم مثلاً صفتی است مراو راضرویۃ الوجود پس چنانکہ جائز نیست مرواجب الوجود را قدیم نباشد ہمچنیں جائز نیست مرذات واجب الوجود را کہ موجود

| | |
|---|---|
| قائل لازم آید کہ چرا موجد است و چرا قدیم است۔ پس جواب آں باشد کہ اگر قدیم نباشد واجب نباشد و اگر موجد نباشد نیز واجب نبود پس ہر کرا درست گردد کہ اسنا دو جود بدوست چارہ نیست کہ اگر گویدا یجاد صفتے است مرا ورا ضرویۃ الجود چنانکہ قدیم والسلام (۳۵) | (موجد) نباشد پس قول قائل چرا موجد است چناں باشد کہ چرا قدیمست پس جواب آں بود کہ اگر قدیم نبود و واجب نبود پس ہر کرا درست کردند کہ اسناد وجود بدوست چارہ نیست کہ گویدا یجاد صفتے است مراورا ضروریۃ الوجود چنانکہ قدم واللہ اعلم۔ والسلام |

اختصار کے پیش نظر انہیں اقتباسات کی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت امیر سے منسوب مکتوبات میں قرآن حکیم کی جو آیات نقل کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں آئی ہے۔ قرآن حکیم کی جو آیات نوزدہ مکتوب میں منقول ہیں وہ یہ ہیں:

سورۃ الاعراف ۱۷۹، سورۃ الحجر ۲۹، سورۃ الذاریات ۲۱، سورۃ الانعام ۱۰۳، سورۃ الحدید ۴، سورۃ ق ۱۶، سورۃ الانبیاء ۲۶، سورۃ المائدہ ۵۴، سورۃ الحجر ۲۹، سورۃ بنی اسرائیل ۸۵، سورۃ الجمعہ ۵، سورۃ الجاثیہ ۲۳، سورۃ العنکبوت ۶، سورۃ الاحزاب ۸، سورۃ المطفّفین ۱۵، سورۃ الاعراف ۱۴۳، سورۃ النجم ۱۷، سورہ بنی اسرائیل ۸۵، سورۃ الحجر ۲۹، سورۃ الحدید ۴، سورۃ الاعراف ۱۴۳، سورۃ آل عمران ۱۲۸، سورۃ الحجر ۳، سورۃ الضحیٰ ۶، سورۃ الانشراح ۴، سورۃ بنی اسرائیل ۸۳، سورۃ القمر ۵۵، سورۃ العنکبوت ۶۴، سورۃ التوبہ ۹۳، سورۃ المطفّفین ۱۵، سورۃ الاعراف ۱۷۲، سورۃ النجم ۴۲، سورۃ العنکبوت ۶۹، سورۃ الرعد ۳۹، سورۃ النور ۳۵، سورۃ الشعراء ۸۷، سورۃ ہود ۵۶، سورۃ الاحزاب ۷۱، سورۃ النساء ۱۰۰، سورۃ الرحمٰن، ۲۶۔۲۷، سورۃ الانبیاء ۸۳، سورۃ القصص ۸۸، سورۃ بنی اسرائیل ۱۵، سورۃ النمل ۲۴، سورۃ الانعام ۱۲۳، سورۃ الزمر ۲۲، سورۃ البقرہ ۷، سورۃ البقرہ ۳۵، سورۃ محمد ۱۹، سورۃ آل عمران ۲۵۳، سورۃ الکہف ۱۰۷، سورۃ سبا ۵۴، سورۃ الشوریٰ ۵۲، سورۃ الاعراف ۱۸۱، سورۃ الانعام ۱۶۳، سورۃ الانعام ۵۲، سورۃ البقرہ ۲۱۶، سورۃ النجم ۱۷، سورۃ بنی اسرائیل ۱، سورۃ ق ۳۰، سورۃ البقرہ ۳۰، سورۃ الفرقان ۷، سورۃ المائدہ ۵۴، سورۃ النجم ۴۲، سورۃ القمر ۵۵، سورۃ البقرہ ۵۵، سورۃ العنکبوت ۶، سورۃ القصص ۸۸، سورۃ یونس ۲۵، سورۃ النور ۴۶، سورۃ القمر ۴۹، سورۃ الصّافّات ۶۹۔ قرآن حکیم کی یہ تمام آیات حضرت امیر

سے منسوب نوزدہ مکتوب میں نقل کی گئی ہیں اور یہ آیات سب کی سب حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی میں موجود ہیں۔

حضرت امیر سے منسوب نوزدہ مکتوب میں تقریباً ۱۵/ احادیث منقول ہیں۔ان میں وہ تمام صحیح اور غیر صحیح احادیث شامل ہیں جو حدیث کی حیثیت سے پیش کی گئی ہیں۔ہم نے ان کی فہرست بنائی۔یہ تمام احادیث سوائے ایک کے مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی میں ایک نہیں کئی کئی مقامات پر اسی سیاق وسباق اور سیاق وسباق کے انہیں الفاظ میں آئی ہیں جس سیاق وسباق کے ساتھ نوزدہ مکتوب میں دی ہوئی ہیں۔ایک حدیث جو شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں نہیں ملی وہ نوزدہ مکتوب میں ''نیز میگویند'' کے بعد نقل کی گئی ہے۔لگتا ہے کہ نوزدہ مکتوب کے ناقل نے یا تو اپنی طرف سے حدیث مخطوطہ میں دے دی ہے۔یا شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کی کتابت کے دوران کاتب سے چھوٹ گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

نوزدہ مکتوب میں جو امثال بیاں ہوئی ہیں وہ سب کی سب شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں ملتی ہیں اور یہ امثال ان مکتوبات میں جگہ جگہ آئی ہیں۔

نوزدہ مکتوب میں کم وبیش ۱۳۵ اشعار منقول ہیں۔ان میں سے بعض اشعار مکرر آئے ہیں۔ چند مقامات پر ایک ہی مصرعہ دیا گیا ہے۔یہ سارے اشعار اور مصرعے شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں اسی سیاق وسباق کے ساتھ موجود ہیں جس کے ساتھ نوزدہ مکتوب میں دیے گئے ہیں۔

اضافات، تراکیب اور تلمیحات جو نوزدہ مکتوب میں آئی ہیں۔مثلاً صفوتِ آدم، خلتِ خلیل، مکالمتِ کلیم، روحانیتِ روح اللہ، حسرتِ آدم، فریادِ نوح، بے کامی خلیل، مصیبتِ یعقوب، چاہ وزندانِ یوسف، تیغ برگردنِ یحییٰ، ارہ برفرقِ زکریا، جگرسوختۂ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوزدہ مکتوب میں موجود ہیں اور یہ تمام شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کے صفحات کی زینت ہیں۔

شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں جن کتابوں کے نام اور حوالے آئے ہیں۔ان میں یہ کتابیں شامل ہیں۔قوت القلوب، کشف المحجوب، احیاء علوم الدین، زاد الارواح، زبدہ، تمہیدات، تفسیر امام زاہد، نوزدہ مکتوب میں بھی انہیں سات کتابوں کے نام اور حوالے آئے ہیں۔

نوزدہ مکتوب میں حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یونس، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام وغیرہ کے جو اقوال یا واقعات دیے گئے ہیں۔ وہ شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں پورے سیاق و سباق کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حارثؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت مغیرہؓ کے جو آثار و اقوال نوزدہ مکتوب میں آئے ہیں وہ تمام شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں بھی ہیں۔ نیز نوزدہ مکتوب میں جن علماء صوفیہ شعراء متمردین، جنات اور فرشتوں کے نام آئے ہیں یا ان کے اقوال یا واقعات منقول ہیں۔ مثلاً یحییٰ معاذ رازی، حضرت بایزید بسطامی، عین القضاۃ ہمدانی، امام شبلی، شیخ سری سقطیٰ، شیخ عطار، امام محمد غزالی، امام ابن سیرین، حضرت حسن بصری، حضرت رابعہ بصری، شاہ شجاع کرمانی، محمد معشوق، امیر خسرو، امام جعفر صادق، شیخ ابوطالب مکی، شیخ جنید، شیخ ابراہیم ادہم، شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ سہل تستری، شیخ ابوعلی دقاق، شیخ ابوبکر زقاق، شیخ حسین منصور، امام اعظم کوفی، وہب بن منبہ، ابوشکور سالمی، امام زاہد، فخرالدین عراقی، شیخ عبداللہ انصاری، عابد بنی اسرائیل (بلعم بن باعور) آزر، نمرود، فرعون، قارون، ملکہ بلقیس، ابلیس، شیطان، حضرت جبرئیل امینؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ وغیرہ۔ یہ سب شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں آئے ہیں۔ نوزدہ مکتوب اور شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں ان سب کے اقوال یا ان کے متعلق واقعات یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نوزدہ مکتوب کے خطی نسخوں کے عنوانات میں نوزدہ مکتوب مرغوب اور نوزدہ مکتوب مرغوب مطلوب کے الفاظ ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مکتوبات جوابی کے دیباچے میں مکتوباتِ مرغوب اور مکتوبات دوصدی کے مقدمے میں مکتوب مرغوب و موصل الی المقصود المطلوب کے الفاظ ہیں جو نوزدہ مکتوب اور شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔

اسلوب کے لحاظ سے بھی حضرت امیر سے منسوب نوزدہ مکتوب کا معاملہ غور طلب ہے۔ حضرت امیر کے اسلوب سے نوزدہ مکتوب کا اسلوب بالکل الگ ہے۔ نوزدہ مکتوب کا اسلوب حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا اسلوب ہے۔

زیر بحث نوزدہ مکتوبات کے بارے میں شاید یہ شبہ ہو کہ حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ ہی سے غلط

طور پر منسوب ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ نوزدہ مکتوب میں جیسا کہ نام سے عیاں ہے صرف انیس مکتوب ہیں جبکہ دستیاب شواہد کے مطابق حضرت شیخ منیریؒ کے مکتوبات صدی، مکتوبات جوابی اور مکتوبات دوصدی کے مکتوبات کی تعداد تین سو اٹھائیس ہے۔ بعض مورخین کے مطابق مکتوبات کا ایک اور مجموعہ بھی ہے۔ حضرت امیر سے منسوب نوزدہ مکتوب کے مضامین مکتوبات دوصدی میں تکرار کے ساتھ آئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ نے یہ مکتوبات مختلف مریدوں اور معتقدوں کے نام تحریر کیے ہیں۔

حضرت شیخ منیریؒ (۶۶۱ھ۔۷۸۲ھ/۱۲۶۳۔۱۳۸۱ء) حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی (۷۱۴۔۷۸۶ھ/۱۳۱۴۔۱۳۸۵ء) سے ۵۳ سال بڑے تھے۔ مکتوبات صدی حضرت منیریؒ نے چوسہ (ضلع بھاگلپور) کے قاضی شمس الدین کے نام تحریر کیے ہیں۔ ان مکتوبات کو حضرت شیخ کے ایک مرید زین بدر عربی نے ۷۴۱/۷۴۷ھ میں جمع کیا ہے۔ اس وقت حضرت امیر سید علی ہمدانی کی عمر ۲۷ یا ۳۳ سال تھی اور وہ اپنے مرشد کے حکم پر مختلف علاقوں کی سیاحت کر رہے تھے۔ حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات دوصدی مختلف مریدوں اور معتقدوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ انہیں اشرف ابن رکن نے ۷۶۹ھ میں جمع کیا ہے۔ ان مکتوبات کے مخاطبین کے نام بھی دیے گئے ہیں۔ مخاطبین کے نام شیخ عمر، قاضی شمس الدین، قاضی زاہد، مولانا کمال الدین سنتوشی، مولانا صدرالدین، ملک خضر، ملک شمس الدین، خواجہ خاص پوری، رضی الملک محمود، مولانا عمر، مولانا حمید، شیخ عمر ظفرآبادی، مولانا مظفر، ملک مفرح، امام نظام الدین، قاضی حسام الدین، شیخ مغربی، فیروز شاہ تغلق، داؤد ملک، داماد سلطان محمد تغلق، مولانا قیام دین، مولانا بایزید، نصیر دین فوجانی، امین خان، قطب الدین، عبدالملک، شیخ سلیمان، امام مظفر، شمس الدین برہان حدادی، اما افتخار، خواجہ مہذب، فخر الدین ملک معزالدین، خواجہ احمد، محمد دیوانہ، مولانا محمود، جمال الدین، امام تاج الدین طاہر، مولانا رفیع الدین، مولانا تقی الدین، مولانا محمد بزرگ سلطان محمد شاہ تغلق وغیرہ ہیں۔ ایک مکتوب انہوں نے والدہ ماجدہ کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔ ان میں سے بعض مخاطبین کے نام کئی کئی خطوط ہیں۔ حتیٰ کہ شیخ عمر کے نام مکتوبات دوصدی ہی کے شروع میں اٹھارہ مکتوبات ہیں۔

مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی کے علاوہ ایک اور مجموعہ 'مکتوباتِ بست وہشت' کے نام

سے موجود ہے۔ حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ نے اپنے ایک مرید مولانا مظفر بلخی کے نام دو سو سے زائد خطوط تحریر کیے تھے۔ مولانا مظفر نے انہیں عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی غرض سے وصیت کی تھی کہ ان تمام خطوط کو ان کے ساتھ قبر میں رکھا جائے۔ چنانچہ حسبِ وصیت یہ خطوط ان کے ساتھ قبر میں دفن کیے گئے۔ ان میں سے بعض خطوط ان کی تھیلیوں کے درمیان رہ گئے اور دفن ہونے سے بچ گئے۔ یہ اٹھائیس خطوط تھے۔ انہیں 'مکتوبات بست وہشت' کہا جاتا ہے۔ اور یہ مکتوبات جوابی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ اس طرح حضرت شیخ یحییٰ کے مکتوبات، مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی اور مکتوبات جوابی کے نام سے مشہور ہیں۔

نوزدہ مکتوب میں خطوط کے مخاطبین کے نام نہیں دیے گئے ہیں۔ مگر مکتوبات دوصدی میں ان مکتوبات کے مخاطبین کے نام بھی آئے ہیں۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

نوزدہ مکتوب کا مکتوب اول در اقسام عالم مکتوبات دوصدی میں شیخ عمر کے نام ہے۔

نوزدہ مکتوب کا مکتوب دوم در بیان موجودات مکتوبات دوصدی میں نصیر الدین فوجانی کے نام خطوط کے ذیل میں ہے۔

نوزدہ مکتوب کا مکتوب سوم در طلب علم مکتوبات دوصدی میں شیخ عمر اور مولانا صدر الدین کے نام مکتوبات میں آیا ہے۔

نوزدہ مکتوب کا مکتوب چہارم در تجرید وتفرید مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی میں قاضی شمس الدین کے نام ہے۔

نوزدہ مکتوب کے باقی خطوط مکتوبات دوصدی میں قاضی زاہد، شیخ عمر شمس الدین، رضی الملک محمود، خواجہ خاص پوری، مولانا کمال الدین سنتوشی ، ملک خضر وغیرہ کے نام تحریر کیے گئے ہیں ۔ مکتوبات دوصدی میں کبھی ایک ہی مضمون کا مکتوب متعدد مخاطبین کے نام تحریر کیا گیا ہے اور کہیں متعدد مکتوبات ایک ہی مخاطب کے نام لکھے گئے ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ اور حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے درمیان مستحکم روحانی رشتے تھے۔ حضرت امیر کا شجرہ طریقت حضرت نجم الدین کبریٰؒ (الشہید

۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء) سے ملتا ہے۔ حضرت شیخ منیریؒ کا سلسلہ فردوسیہ سلسلہ کبرویہ ہی کی شاخ ہے۔ اس طرح دونوں سلسلہ کبرویہ سے وابستہ تھے۔ حضرت امیرؒ نے دوران سیاحت حضرت شیخ منیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے ملاقات کی تھی انہوں نے چھ ماہ تک حضرت شیخ سے کسب فیض کیا تھا اور ان سے سند خلافت پائی تھی۔ حضرت امیر حضرت شیخ منیریؒ سے عمر میں ۵۳ سال چھوٹے تھے۔

ان تمام تفصیلات سے حضرت امیر سے منسوب نوزدہ مکتوب کی یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ مضامین، الفاظ و عبارات اور اسلوب کے لحاظ سے ان مکتوبات کا حضرت امیر کبیرؒ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی اصل یہ ہے کہ یہ حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات ہیں اور مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی میں موجود ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## حواشی

(۱) نوزدہ مکتوب مرعوب از تصنیف قدوۃ الواصلین و امام العارفین حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی مخطوطہ مملوکہ گورنمنٹ آرکیوز لائبریری سرینگر، شعبہ مخطوطات زیر اندراج نمبر ۲۴۹۔ (۲) حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ۔ مکتوبات (مکتوبات صدی) مطبع نول کشور کانپور بار سوم ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء ص ۳۔

(۳) نوازدہ مکتوب مرغوب مخطوطہ مملوکہ گورنمنٹ آرکیوز لائبریری سرینگر مکتوب اول۔

نوازدہ مکتوب مرغوب مخطوطہ مملوکہ علامہ اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی، زیر اندراج نمبر ۶۵۹۰، مکتوب اول۔

مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری رامپور زیر اندراج ۳۷۷، مکتوب اول۔

مخطوطہ مملوکہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، مکتوب اول۔

آگے ان چاروں کا حوالہ 'مخطوطات مذکورہ بالا' کے عنوان سے آئے گا۔

(۴) حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ۔ مکتوبات دوصدی مشمولہ سہ صدی مکتوبات لاہور مکتوب ہفتم، ص ۳۵۳۔

(۵) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب اول۔ (۶) مکتوب دوصدی مکتوب ہفتم، ص ۳۵۳۔ (۷) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب اول۔ (۸) مکتوب دوصدی مکتوب ہفتم ۳۵۴۔ (۹) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب دوم۔ (۱۰) مکتوب دوصدی مکتوب صد و یکم، ص ۴۹۷، ۴۹۸۔ (۱۱) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب دوم۔ (۱۲) مکتوب دوصدی مکتوب

صد و یکم، ص ۴۹۸۔ (۱۳) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب دوم۔ (۱۴) مکتوب دوصدی مکتوب صد و یکم، ص ۴۹۸۔ (۱۵) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب سیوم۔ (۱۶) مکتوب دوصدی مکتوب دوم، ص ۳۴۰۔ (۱۷) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب سیوم۔ (۱۸) مکتوب دوصدی مکتوب چہل و پنجم، ص ۴۳۱۔ (۱۹) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب سیوم۔ (۲۰) مکتوب دوصدی مکتوب چہل ہفتم، ص ۴۲۷۔ (۲۱) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب نہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۵۲۔ (۲۲) مکتوب دوصدی مکتوب نسبت و دوم، ص ۳۹۱۔ (۲۳) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب نہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۵۳۔ (۲۴) مکتوب دوصدی مکتوب بست و دوم، ص ۳۹۱-۳۹۲۔ (۲۵) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب سیز دہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۲۶۔ (۲۶) مکتوب دوستی مکتوب پنجاہ و چہارم، ص ۴۳۵۔ (۲۷) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب سیز دہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۶۲۔ (۲۸) مکتوب دوصدی مکتوب پنجاہ و چہارم، ص ۴۳۶۔ (۲۹) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب ہفدہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۳۷۔ (۳۰) مکتوب دوصدی سیوم، ص ۳۴۴۔ (۳۱) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب ہفدہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۴۷۔ (۳۲) مکتوب دوستی، مکتوب سیوم، ص ۳۴۴۔ (۳۳) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب نوز دہم، مکتوبات میر سید علی ہمدانی ۲، ص ۸۳۔ (۳۴) مکتوب دوصدی، مکتوب ہشتاد و دوم، ص ۴۷۴۔ (۳۵) مخطوطات مذکورہ بالا مکتوب نوز دہم۔ (۳۶) مکتوب دوصدی مکتوب ہشتاد و دوم، ص ۴۷۵۔

مضمون کی تیاری میں حضرت امیر کے اصل مکتوبات اور ان سے منسوب نوزدہ مکتوبات کے جن خطی اور مطبوعہ نسخوں نیز مکتوبات کے اردو اور انگریزی ترجموں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ان کی تعداد اکیس ہے۔ ان کی تفصیل مضمون میں آچکی ہے۔ حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کے جن نسخوں سے استفادہ کیا گیا وہ یہ ہیں:

۱۔ مکتوب صدی نسخہ عہد مصنف عکسی ایڈیشن از مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۴ء۔ ۲۔ مکتوبات حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (مکتوبات صدی) مطبع منشی نول کشور کانپور، بار دوم ۱۸۹۸ء۔ ۳۔ مکتوبات حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (مکتوبات صدی) مطبع منشی نول کشور کانپور، بار سوم ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء۔ ۴۔ سہ صدی مکتوبات (مکتوبات صدی، مکتوبات جوابی، مکتوبات دوصدی ۱۵۳ مکتوبات) فرمودہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، کتب خانہ اسلامی پنجاب، لاہور۔ ۵۔ مکتوبات دوصدی، جلد دوم، مطبع شرفی پریس، بہار۔ ۶۔ مکتوبات جوابی، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، مطبع نول کشور کانپور، دسمبر ۱۹۱۰ء۔

# شبلی خطوط ماجدی میں

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

جریدہ عالم پر ثبات ودوام کا ایک اظہار شبلی ہے، ان کی ہمہ گیر شخصیت اور ہمہ جہت عبقریت کا ذکر تمام اوراق مصور میں ملتا ہے۔ ان میں سے ایک ورق منور و معطر خطوط ماجدی کا ہے۔ معاصرین سے لے کر متاخرین تک، مداحین سے نقادوں بلکہ تنقیص نگاروں تک سب ان کے نام کی مالا جپتے ہیں اور یہ جاپ ان کے اپنے ظرف کے مطابق اور مزاج وقلم کے موافق ہوتا ہے۔ شرفا خامہ نویسی کرتے ہیں یاران طریقت خامہ فرسائی، مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے خطوط میں مختلف احوال ومقامات پر ذکر شبلی سے مضامین کو آراستہ کرتے ہیں، خطوط ماجدی مرتبہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری میں موصوف کا ذکر خیر مکتوب الیہم کے خطوط کے جوابات ماجدی میں آتا ہے۔ وہ بسا اوقات ادھورا رہ جاتا ہے کہ مکتوب الیہ کا استفسار یا منشاء کیا تھا؟ اس کا صرف جواب سے قیاس کرکے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مرتب خطوط نے کہیں کہیں مکتوب الیہ کے استفسار، سوال اور منشا کا حوالہ دیا ہے۔ وہ ایسے جوابات کا ابہام کسی قدر دور کرتا ہے۔ متعدد خطوط میں حضرت دریابادی نے شبلی کا ذکر اپنے خیال سے کیا ہے۔ وہ خاصہ کی چیز ہے اور بتاتا ہے کہ فکرِ دریابادی میں مقام شبلی کیا ہے؟

**دریابادی کا اعتراف احسان شبلی:** مولانا عبدالماجد اگرچہ شبلی کے رسمی شاگرد نہ تھے مگر معنوی تلمیذ تھے اور پروردہ و پرداختہ تو تھے ہی۔ مختلف خطوط میں وہ شبلی کے احسان وکرم، مہربانی وشفقت اور تربیت وتعلیم اور مجالس شبلی میں شرکت واستفادہ کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی ان کا تنہا ذکر آتا ہے۔ کبھی دوسروں کے ساتھ حضرت شبلی کو شامل کر لیتے ہیں۔

عبدالعزیز کمال کے نام اپنے خط نمبر۔۱ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۵۵ء اپنے تین محسنین کا ذکر

---

پروفیسر، صدر، ڈائریکٹر (سابق) ادارہ علوم اسلامیہ وشاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کس خوبی سے کیا ہے:

ا۔''حضرت جوہر کا کہنا ہی کیا، باقی شبلی وا کبر بھی، میرے حق میں بڑے مہربان تھے۔ چھوٹوں کے دل بڑھانا، ان کی ہمت افزائی کرتے رہنا، بزرگوں کے معمولات میں داخل ہے اور تینوں حضرات میرے بزرگ ہی تھے۔ ان کے حوصلہ افزایانہ الفاظ میں میری اہلیت کو ذرا بھی دخل نہیں۔''(ص ۵۱-۵۲)

**تصنیفی شعور و تربیت شبلی:** بقول مرتب نادم سیتاپوری نے ''تصنیفی شعور کی رہنمائی اور تربیت میں کن کتابوں اور مصنفوں نے حصہ لیا'' کے جوابات دریابادی ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

ا۔سب سے بڑھ کر مولانا شبلی، ان سے کم درجہ میں کچھ اور لوگ ہیں۔

۲۔سب سے بڑھ کر مولانا شبلی کی ''الکلام'' اور رسائل......''

۳۔پھر وہی مولانا شبلی، جب کالج کی زندگی شروع ہوئی تھی تو مولانا سے ذاتی نیازمندی اور حاضر باشی بھی رہی، ادبی اور شعری مذاق جو کچھ بھی پیدا ہوا مولانا ہی کا فیض ہے......''(ص ۹۹-۱۰۰)

**شبلی پر مقالات و مضامین کی تعریف دریابادی:** خطوط ماجدی میں مولانا شبلی پر دوسرے اہل علم کی تصنیف کردہ کتب و مقالات اور مضامین کی تعریف و تحسین کی ہے۔ اصلاً تو مصنفین و مقالات نگار حضرات کی تحسین ہے لیکن شبلی کی ذات والاصفات سے ان کی شیفتگی در پردہ جلوہ آرائی کرتی ہے۔

ا۔مولوی محمد مقتدا خان شروانی علی گڑھ کے نام اپنے خطوط نمبر-۲ میں بقول مرتب ''مولانا شبلی پر مکتوب الیہ کے ''مضمون کے جواب میں'' لکھا تھا'' آپ ماشاءاللہ پیدائش کے وقت سے مقتدا ٹھہرے، آپ کی ہر قراءت پر ہم مقتدیوں کو آمین کہنا واجب، خواہ بالجہر ہو یا بالسر''۔(ص، ۴۷-۴۳، مورخہ ۲۵؍فروری ۱۹۵۸ء)

۲۔آفتاب احمد ردولوی (ڈھاکا): ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب کے نام اپنے خط نمبر-۲ مورخہ ۱۸؍اپریل ۱۹۵۹ء میں ان کی تصنیف ''صہبائے مینائی'' کی وصولیابی کی رسید دیتے ہوئے ان کی شبلی پر کتاب کا تقاضا خوبصورت انداز سے کیا ہے:

''......شبلی'' کی زیارت کو تو آج تک آنکھیں ترستی ہیں......''۔(ص ۱۱۵، ڈاکٹر موصوف کی کتاب مولانا شبلی پر اولین اور عمدہ تجزیاتی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔)

**شبلی کی شاعری/غزل:** حضرت دریابادی مولانا شبلی کی شاعری اور غزل سرائی کے بھی مداح تھے۔ اپنے بعض خطوط میں مولانا موصوف کی شاعری پر خوبصورت اور نادر تبصرے بھی کیے ہیں۔ ان کے

بعض اشعار کو اپنے خط کے مضمون میں نقل بھی کیا ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے اوران کے تخلص کی واقعیت بھی اجاگر کی ہے۔

شورش کاشمیری مدیر چٹان لاہور کے اپنے ایک طویل مکتوب نمبر۔۲ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں مولانا شبلی کے بارے میں بعض حقائق و معلومات پیش کیے ہیں۔

۳۔الف: ’’مولانا شبلی کا اصل تخلص صرف شبلی ہی تھا، شبلی نعمانی بس کہیں کہیں ضرورت وزن ہی سے لائے ہیں‘‘۔

ب: مولانا شبلی کے قیام حیدرآباد کا زمانہ قیام لکھنو سے قبل کا ہے۔ داغ کی جس صحبت کا ذکر آتا ہے مولانا شبلی اس وقت جوان تھے‘‘۔ (ص: ۲۱۰۔۲۱۱)

**شعر شبلی:** حضرت دریابادی ادب و شعر کا مذاق لطیف رکھتے تھے۔ موقع موقع سے اپنے خطوط میں مصرعے یا پورے شعر کسی نہ کسی سیاق میں لے آتے اور اسے استعارہ کنایہ بنا کر اپنے مضمون اور شکوہ و شکایت میں طنزیہ کاٹ پیدا کرتے تھے۔ ایک آدھ جگہ شبلی کا شعر بھی نقل کیا ہے۔ اس کا پس منظر اس کے برمحل استعمال کا لطف دوبالا کردے گا۔ حیات اللہ انصاری مدیر قومی آواز دریاباد ڈاکٹر امین دریابادی کی تعزیت کے لیے گئے اور قیام کسی دوسری جگہ کیا۔ مولانا دریابادی نے اپنے خط مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء میں ان کو شکوہ و شکایت کا خط لکھا جس میں شعر شبلی کا سیاق یہ ہے ’’...... امین مرحوم کا قریب ترین عزیز بزرگ میں ہی تھا اور مجھ ہی سے یہ بیگانہ وشی و بے التفاتی ؎

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے  محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

(ص ۱۴۴، اس کے بعد کا جملہ اور اس کے سیاق میں ایک شعر بھی اسی خط کے آخر میں ہے:

’’بیگانہ وشی کا ریکارڈ قائم کرنا اسی کو کہتے ہیں! ع بھول جانا ہمارا یاد رہے‘‘ موخر الذکر مصرع دریابادی شکایت ناموں میں برابر منقول ہوا جوان کی پسند خاطر کا پتہ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۴۳ نورالحسن ہاشمی، ۱۰۹، بھول جانا ہمارا یاد رہا (ترمیم کے ساتھ) گورنر یوپی کو یاددہانی کے لیے)۔

**شبلی غزل خواں:** مولانا غلام رسول مہر (لاہور) کے نام اپنے خط نمبر ۲ میں ایک نادر بیان کے ساتھ شبلی کا مذکورہ شعر نقل کیا ہے: ’’مولانا شبلی مرحوم غزل بہت کم کہتے تھے۔ ان کی غزل کا شعر اس وقت یاد آرہا ہے‘‘ پھر شبلی کے گھر والا شعر نقل کیا ہے اور اس کا سیاق بھی یہ ہے کہ مولانا مہر لکھنو آمد پر ان کے کاشانے ’’خاتون منزل‘‘ میں قیام فرمائیں۔ (ص ۲۳، خط مورخہ ۲۹ر جون ۳۰ء)

**شبلی کی ادبی منزلت:** مولانا دریابادی شبلی کی ادبی منزلت ومرتبت اوران کی انشا پردازی اورادبیت کے بھی مدح خواں تھے اور بعض خطوط میں اس کا ذکر آتا ہے اگر چہ دوسروں کے حوالے سے اور دوسرے سیاق وسباق میں ہے:

احمد جمال پاشا لکھنؤ کے مکتوب میں چند سوالات تھے جن کے جوابات ان ہی کے سامنے لکھ دیے تھے۔

۲۔"سرسید شبلی، آزاد، حالی میں کسے آپ انشائیہ نگار کی حیثیت سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

جواب دریابادی ہے:"ان چاروں میں انشائیہ نگار صرف آزاد تھے، باقی تینوں اپنی اپنی جگہ اچھے لکھنے والے اور ماہر فن ادیب تھے لیکن انشا پردازی ان میں سے کسی کی مقصود اصلی نہ تھی......"۔(ص ۱۲۲، مورخہ ۲۶/اپریل ۱۹۵۹ء، آزاد سے مراد محمد حسین آزاد ہیں)

**اکابر سے موازنہ:** شورش کاشمیری کے مکتوب نمبر۲ کے سوالات کے جوابات میں دریابادی نے مولانا شبلی کی منزلت ومرتبت کے علاوہ ان کے بزرگ معاصرین سے موازنہ بھی کیا ہے اور بہت اہم انکشافات کیے ہیں:

۶۔"مولانا شبلی سرسید سے سن میں بہت چھوٹے تھے اوران کا بڑا ادب کرتے تھے۔ تحقیق کے لیے استفسار ضرور انھوں نے کیا ہوگا لیکن آج کل کے پڑھنے والوں پر اگر اس سے یہ اثر پڑے کہ دونوں ہم سن اور باہم بے تکلف دوست تھے تو یہ صحیح نہیں"۔

۷۔"نذیر احمد کے لیکچر پر آزاد کی اصلاح والی روایت ذرا تشنہ ہے۔ میں نے اسے اول بار مہدی افادی مرحوم سے بحوالہ مولانا شبلی سنا لیکن جب خود مولانا سے دریافت کیا تو انھوں نے اس سے بالکل انکار فرمایا اور کہا کہ نذیر احمد بھلا اسے کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اپنا لیکچر اصلاح کے لیے کسی کے آگے پیش کریں......"۔(ص ۲۱۱-۲۱۲)

**مولانا شبلی، فراہی، مولانا ابوالکلام آزاد شناسی:** ڈاکٹر اسرار احمد مدیر میثاق لاہور کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱/نومبر ۱۹۶۸ء میں میثاق نومبر ص ۱ سے ص ۱۴ پر مطبوعہ مضمون کے بارے میں تعریف وتحسین کرتے ہوئے لکھا:"......حیرت ہوتی ہے کہ شبلی، فراہی، ابوالکلام آزاد تینوں کی نباضی بُعد زماں وبُعد مکاں دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کرلی......"۔(ص ۱۸۴)

**نقد شبلی:** نادم سیتاپوری نے اپنے دوسرے خط میں مولانا دریابادی سے کچھ مزید استفسارات

کیے تھے جن کے جوابات ترتیب وار دیے گیے ان میں سے اول جواب دریابادی یہ ہے:

ا۔ ''جی ہاں، الناظر میں وہ سلسلہ مضامین ایک طالبِ علم کے فرضی نام سے اپریل ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک سات نمبروں میں جاری رہا تھا اور بڑے لوگوں نے اس وقت بڑی ہمت افزائی کی، میں اس وقت انٹر کا طالب تھا''۔(ص ۱۰۰۔۱۰۱، دریابادی خط مورخہ یکم نومبر ۱۹۵۷ء میں مولانا دریابادی نے اپنے سات جوابات میں اپنے اساتذہ، بزرگوں، والد ماجد اوران کے احباب کا اور اپنے برادر کے علاوہ اپنی سیتاپور کی تعلیم و تربیت اور علمی مضامین لکھنے کا ذکر کیا ہے، اول الذکر صرف مولانا شبلی سے متعلق ہے جس پر نادم سیتاپوری کا ہی حاشیہ ہے: ''مولانا شبلی کی الکلام پر ''ایک طالب علم'' کے نام سے مولانا نے یہ تنقید کی تھی، بہ قول دریابادی، مولانا شبلی کے نام کی صرف آڑ تھی، تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری، رسالت پر تھی۔'' (آپ بیتی صفحہ ۲۱۳)

اگلے خط نمبر ۴ میں نادم سیتاپوری ہی کے نام مولانا شبلی کا حوالہ دیے بغیر مزید تصریح کی ہے: ''......اس وقت تمام تر ملحد تھا۔ دہریہ و منکر خدا کے مضمون ہیں بلکہ Rationalism ''لاادریہ'' کے معنی میں، تنقید یکسر عقائد اسلامی، وجود باری، نبوت، ضرورت مذہب وغیرہ پر تھی۔ الکلام کو صرف آڑ بنالیا تھا، عمر اس وقت ۱۸۔۱۹ سال کی تھی۔''(ص ۱۰۲)

**اعتزال کا الزام:** نادم سیتاپوری ہی کے خط کے جواب میں دریابادی کے خط نمبر ۴ مورخہ ۲۰/مارچ ۱۹۵۸ء فرمودہ دریابادی ہے: ''اور تو یاد نہیں پڑتا، اتنا یاد ہے کہ آخر جنوری میں آپ کا جو خط ملا تھا اس میں یہ سوال تھا ''شرر نے شبلی پر اعتزال کا الزام کیسے لگادیا؟'' جواب میں یکم فروری کو عرض کر دیا تھا کہ شرر نے ٹھیک لکھا۔ شبلی کا اعتزال ان کے ''الکلام'' میں نمایاں ہے۔ علم الکلام اور مقالات وغیرہ میں بھی کسی قدر جھلک رہا ہے۔ بعد کو ان کی جو ''تکفیر'' ہوئی وہ انھیں عقائد کی بنیاد پر......۔''(ص ۱۰۳)

**دریابادی تصحیح واقعات:** بعض خطوط ماجدی میں مولانا دریابادی نے اپنے معاصرین کے غلط بیانات کی تصحیح کی ہے اور اس میں بھی اسلوب دریابادی خوب ہے۔ صادق الخیری (دہلی) کے نام اپنے خط نمبر ۸ میں لکھا ہے کہ ''پرسوں لکھنؤ جا کر ظفر حسین خاں کی قبر پر فاتحہ پڑھ آیا۔ سرور صاحب نے خدا معلوم یہ کہاں سے لکھ دیا کہ مرحوم مولانا شبلی کے شاگرد تھے''۔(ص ۶۱، خط مورخہ ۷/اگست ۶۱ء، مرتب گرامی نے تعارف میں یہ لکھا ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے ظفر حسین خاں کے انتقال پر ہماری زبان علی گڑھ میں جو تعزیتی نوٹ لکھا تھا اس میں مرحوم کو علامہ شبلی کا شاگرد لکھ دیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی)

**تجزیہ وتنقید:** عبقری ادبی وعلمی شخصیات کا ذکر واذکار معاصرین ومتاخرین کی مختلف النوع نگارشات میں کسی نہ کسی طرح آہی جاتا ہے خواہ وہ تذکار جمیل ہو یا نقد وتنقید ہو، صاحبان علم وفضل وظرف توازن و اعتدال برتتے ہیں، مدلل مداحین صرف مفصل مداحی کرتے ہیں اور حاسدان وتنقیص نگاران وقت اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔شبلی کے مدح وقدح میں یہ تمام سہ گونہ اطراف وجہات ملتے ہیں،ادبی و علمی نگارشات میں خطوط ومکاتیب ومراسلات بھی بسا اوقات شامل ہوجاتے ہیں کہ صاحبان علم وفضل ان میں بھی گہرباری کرتے ہیں۔خطوط ومکاتیب کے تجزیہ وتحلیل میں ناقدین ومبصرین نے گونا گوں اطراف کا پتہ لگایا ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ مکاتیب نگاران میں اپنے بارے میں کھل کر بغیر لاگ لپٹ کر لکھتا ہے لیکن وہ نجی خطوط ہوتے ہیں اور برائے اشاعت وطباعت نہیں ہوتے مگر شخصیات کے خطوط کیسے بھی ہوں چھاپ دیے جاتے ہیں۔بہت سے اہل قلم خطوط نگاری سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اوران کی اشاعت وطباعت کے خواہاں ہوتے ہیں،لہٰذا وہ ان میں بھی نہیں کھلتے اور ایسے مکاتیب نگار اپنے خطوط کی نقول بھی پاس رکھتے ہیں کہ مکتوب الیہم توجہ نہ دیں تو وہ خود چھاپ دیں،مراسلات نگاری میں طرفین کے خطوط اوران کے جوابات ساتھ ساتھ ہوں تو ان کے سیاق وسباق کا بیشتر احوال میں صحیح پتہ چل جاتا ہے۔خالی جوابات والے خطوط ومکاتیب میں بسا اوقات ان کے سیاق وسباق ہی کا نہیں اصل مضمون وموضوع کا بھی ابہام رہ جاتا ہے۔اسے مرتبین کرام کو اپنی سمجھ اور مطالعہ اور تجزیہ وتحلیل سے دور کرنا پڑتا ہے۔خطوط ماجدی کے مرتب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے یہی کیا بھی ہے۔بعض دوسرے اکابرین ومرتبین کی طرح مرتب حضرات اگر صاحب مکتوب ومکاتیب کے ناقد محض یا تنقیص نگار ہوں تو وہ کافی گل کھلاتے ہیں جیسے مرتب خطوط ماجدی ہیں۔بہرحال ان خطوط ماجدی سے مختلف علوم و فنون، ادبی وعلمی جہات، مسائل ومعاملات کے علاوہ مختلف شخصیات عصر اور عبقریات دوراں کے بارے میں قیمتی معلومات اور خطوط نویس کے خیالات وافکار اور جذبات واحساسات کا علم ہوتا ہے۔

شبلی اپنے وقت کے ایسے ہی عبقریات میں شامل تھے جن سے صرف نظر کرنا کسی بھی صاحب علم اور صاحب مراسلات کے لیے ممکن نہ تھا۔خطوط ماجدی میں ''ذکر شبلی'' مختلف حوالوں سے بہت سے خطوط میں آیا ہے اور وہ ان کا ایک شخصی مرقع پیش کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ ماجدی مرقع شبلی ہے لہٰذا ان کے رنگ و آہنگ میں مرتب ہوا ہے۔اس سے بہرحال شبلی کی شخصیت وعلمیت وادبیت کے علاوہ ان کے ماحول و زمانہ اور احوال وظروف اور دوسری شخصیات سے ان کے اور ارتباط واتصال کا ایک نیا اور دلآویز مرقع

سامنے آتا ہے جو بہر حال ادھورا ہے کہ دوسری نگارشات ماجدی میں اس مرقع شبلی کے دوسرے رنگ ڈھنگ ملتے ہیں اور وہ فکر وخیال ماجدی کی ایک بھرپور تکمیل کرتے ہیں۔تجزیہ وتنقیدِ خاکسار میں خطوط ماجدی میں شبلی کی مرقع سازی کی گونا گونی کو بعض اور نگارشات ماجدی سے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور ان کا مختصر و جامع اضافہ اسی وجہ سے کیا گیا۔

شبلی اور دریابادی دونوں کے باہمی روابط محبت وعقیدت تھے جو ایک بزرگ وخورد اور ایک مربی و پرورده اور ایک مصنف گر اور ایک مصنف کے درمیان ہوتے ہیں۔دریابادی کی نظر میں شبلی نہ صرف ایک عبقری شخصیت اور بے مثال مصنف اور وسیع القلب مربی تھے بلکہ ان کے ایک آدرش بھی تھے۔بقول خود مولانا محمد علی جوہر، اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی ان کے آدرش ثلاثہ تھے۔دریابادی نے ان تینوں کے بارے میں بڑی جذباتی مگر معروضی اور حقیقی رائے ظاہر کی ہے۔دوسروں کے علاوہ دریابادی نے یہ اعتراف واظہار کیا ہے کہ شبلی نے نہ صرف ان پر سب سے بڑا اور دیرپا اثر ڈالا بلکہ وہ ان کے ادبی وشعری ذوق اور تصنیفی شعور وطریق کو بھی بنانے والے تھے اور اس سے زیادہ وہ شبلی تھے جو رفتہ رفتہ دریابادی کو ان کے الحاد وانکار سے اسلام اور اقرار تک لانے والے مرشد بنے۔نادم سیتاپوری کے خطوط کے جوابات میں خطوط ماجدی اس حقیقت ثابتہ کا مزید اثبات کرتے ہیں۔ان سے ایک گونہ یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ شبلی کا تاثیر وتسخیر قلب ماجدی کا کارنامہ شبلی/تصرف شبلی بعد کے زمانے کا ہے اور اس کے ثبوت میں شبلی کی الکلام پر ان کے ایک طالب علم کے فرضی نام سے سات قسطوں میں نقد ورد کا نوشتہ پیش کیا جاسکتا ہے۔اس مقام پر یہ انتباہ شاید بے محل نہ ہوگا کہ نقد وتنقیص شبلی کے لیے دریابادی نے شبلی کے ایک ناقد وقادح اور ان کے رسالہ الناظر کو منتخب کیا تھا جو آخیر دم تک شبلی شکنی کرتے ہی رہے۔دریابادی شبلی کے مرید وشیفتہ دراصل اپنے لڑکپن میں کالج کی تعلیم سے قبل ہی ہو گئے تھے۔اپنی محسن کتابوں پر ایک جامع ومختصر اور دلنشیں مضمون میں ان کا اعتراف واحسان شناسی نقل کرنا ضروری ہے۔

”......۱۹۰۷ء میں نیاز ”مقالات شبلی اور الکلام“ سے حاصل ہوا۔اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی (۱۷) کا چل گیا، تلاش ان کی اور تحریروں کی شروع ہوئی، انہیں پڑھتا نہ تھا تلاوت کرتا تھا، ”الندوہ“ والد مرحوم کے نام جاری کرایا، پرانا پرچہ سناتا، تازہ پرچے کے لیے دن گنا کرتا، مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھتا، فقرے کے فقرے حفظ ہوگئے، ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں، ہم سنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں......“

(مولانا محمد عرفان خاں ندوی (مرتب)، مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ترتیب جدید وحواشی فیصل احمد بھٹکلی ندوی، ادارہ احیاء علم ودعوت لکھنؤ ۲۰۰۴ ص ۳۵-۴۴ نیز ۲۳۰-۲۴۲ برائے حواشی، حاشیہ ۱۷، ص ۲۳۳ میں حاشیہ نگار کا حاشیہ گری کا کمال ہے: "علامہ شبلی نعمانی نامور مورخ، مشہور ادیب و ادیب گر، علم کلام کے ماہر، قدیم وجدید کے جامع، محسنِ ندوہ، متکلم اسلام، علامہ شبلی نعمانی کا سب سے بڑا وصف ان کی ملی غیرت تھا، وفات: ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء (حیات شبلی از مولانا سید سلیمان ندوی) اس کے علاوہ شبلی پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں"۔ محشی عزیز نے ان حواشی میں بڑی دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے اور کتاب مختصر کو اپنے تعارف مشاہیر اور حواشی سے ایک بلند پایہ تحقیقی کام بنادیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے تحفظات وافکار سے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے اور شبلی پر ان کا حاشیہ "سرکاری ندوی موقف کا" کا غماز ہے۔ شبلی عالم دین اور سیرت نگار کا حوالہ تک نہ آنے دیا اور آگے سیرۃ النبی پر کوئی حاشیہ بھی نہیں لکھا۔ دریابادی پر اثر شبلی کا اولین اظہار کلام ومقالات کے حوالے سے ہوتا ہے اور دوسرا اور رجحان ساز سیرۃ النبی کے مطالعہ دریابادی سے۔ البتہ یہ بھی قابل تعریف حاشیہ عزیز ہے کہ وہ نشریات ماجدی کے حوالے سے شبلی کا ذکر معروضی انداز سے کرتے ہیں۔

تاریخی دستاویز کو صحیح رکھنے اور توقیت تاثیر شبلی کو سدھارنے کی خاطر یہ اظہار امر واقعہ ضروری ہے کہ اول اول دریابادی سحر شبلی میں گرفتار اپنے لڑکپن میں ثانوی/میٹرک کی تعلیم وتربیت اور مطالعہ کے بعد ہوئے تھے جب وہ چودہ پندرہ برس کے رہے تھے جیسا کہ ان کے بیان سے واضح ہے۔ انٹر کے زمانے میں جب وہ ۱۸-۱۹ سال کے نوجوان بلاخیز تھے (۱۹۱۰-۱۹۱۱) تب وہ فلسفہ مغرب اور مستشرقین کے فلسفہ وتاریخ وسیرت نگاری سے متاثر ہوکر الحاد یا عقلیت پرست بن گئے اور اس زمانے میں انھوں نے شبلی کی الکلام کے حوالہ سے یا اس کی آڑ لے کر اسلامی عقائد ومبادیات کے خلاف مضامین لکھے تھے۔ یہ بھی شبلی کا جادو تھا کہ اپنے الحاد وعقلیت پرستی کے اظہار کے لیے انھیں کی تحریروں کو بنایا تھا جن کے وہ عاشق زار رہے تھے اپنے عنفوان شباب میں۔ اور اس کے بعد تیسرا دور تاثیر شبلی کا اس وقت آتا ہے جب وہ ندوہ میں/خاتون منزل کے قیام شبلی کے زمانے میں مولانا مرحوم کے حلقہ دام فکرساز میں آئے اور ان کی مجالس علمی وادبی سے استفادے کیے اور ان کے لیے سیرۃ النبی کے یورپی مواد ومتون جمع کرنے کے کام کیے اور ظاہر ہے کہ وہ ان سے متاثر ہوتے رہے اور آخری ضرب کاری/سحرکاری شبلی کی سیرۃ النبی کی زیارت اور مطالعہ نے کی اور ان کو الحاد وانکار کی دھند سے نکال کر صحت مند رجحان کا حامل

بنادیا اور وہ بقول خود رسول اکرم ﷺ کو مصلح و قائد امت سمجھنے لگے۔ نادم سیتاپوری کے نام دریابادی کے خطوط مذکورہ میں شبلی ہی کو تین تین میدانوں میں رجحان و شخصیت ساز قرار دیا ہے، تصنیفی شعور کی رہنمائی، سب سے موثر الکلام و رسائل شبلی اور سب سے موثر مصنف اور شعری مذاق و ادب ساز۔

دریابادی موقف اور فکر کی معروضیت یا صرف فکر دریابادی بھی قابل تعریف ہے کہ وہ شبلی کے خیال و فکر پر اعتزال کا علانیہ اظہار کرتے ہیں اور توقیت و تاریخ کے اعتبار سے یہ اوائل ۱۹۵۸ء کا ہے جب ان کو الکلام میں ''نمایاں'' اور علم الکلام اور مقالات میں کسی قدر جھلکتا نظر آرہا تھا یعنی جب وہ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھے اور بقول شخصی سٹھیا گئے تھے یا ساٹھے پاٹھے تھے اور بعد میں ان کی جو ''تکفیر'' ہوئی وہ انھیں عقائد کی بنا پر، دریابادی نے اعتزال کے اثرات یا وجود اور ان کی وجہ سے تکفیر کے سلسلہ میں اپنی رائے محفوظ رکھی ہے اور اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ خوب جانتے تھے اور موقف اعتدال بھی رکھتے تھے کہ فکر اعتزال سراسر کفر یا وجہ کفر نہیں ہے اور معتزلہ کو کبھی کافر نہیں قرار دیا گیا۔ صرف ان کے افکار اعتزال پر نقد و تبصرہ کیا گیا۔ سردست اس پر بحث کا موقع نہیں اور نہ ہی محل ہے لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ فکر معتزلہ/ اعتزال سے سب ہی کسی نہ کسی قدر متاثر ہوئے اور وہ خدمت اسلام اور کلام اسلام کے دائرے میں ہوئے اور کبھی خارج از اسلام قرار نہیں دیے گئے۔

فکر و علم و ادب شبلی ہی سے نہیں، دریابادی اپنے خطوط میں شخص و شخصیت شبلی سے سب سے زیادہ متاثر بلکہ ان کے جادوئے ذاتی کے اسیر نظر آتے ہیں۔ وہ ان کی کتابوں کے علاوہ ان پر قابل قدر تصانیف کے رسیا اور مضامین علمی کے مداح تھے، ان کے شعر و ادب کے ناقل و ناقد تھے۔ ان کے اشعار نقل کرتے تھے، ان کی غزل خوانی کی محدودیت بتاتے تھے، ان کے حوالے سے اغلاط یا دوسروں کی مزعومات کی تردید اور تصحیح کرتے تھے۔ شبلی کے زمانے کے اکابر و سادات کے درمیان شبلی کی منزلت و ادبیت اور مرتبت کی حدود مقرر کرتے تھے۔ ارکان خمسہ اردو کے درمیان ان کا مقام و مرتبہ تشخیص کرتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد، سرسید کے باب میں بالخصوص دریابادی کے موازنے سے ان کی صحت فکر اور معروضیت کا ثبوت ملتا ہے۔ خطوط ماجدی میں شبلی شخص و فن کا ایک متوازن، معتدل اور بقول شخصے ''صحیح العقیدہ'' محاسبہ ملتا ہے جو عام طور پر صاحبان علم و ادب اور ناقدین علوم و شخصیات کے ہاں مفقود، مجروح یا غیر معتدل ہوتا ہے۔

# اکبر الہ آبادی کا شعری مطالعہ

## تہذیبی تصادم کے تناظر میں

جناب مبشر اعجاز

پروفیسر فلپ سیموئل ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۳ء کے وسط میں مشہور زمانہ تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کیا لیکن اسی کے ساتھ یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ اس نوع کے خیالات کا اظہار متعدد مصنّفین اور اہل دانش پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس کی مشہور کتاب "تہذیبوں کے تصادم" کا بنیادی تصور ۱۹۳۶ء میں شائع ایک کتاب "کلچر کا تصادم" سے مستعار لیا گیا ہے۔ بارہا یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ فکر و عمل سے لبریز تہذیبیں ایک مضبوط اور مستحکم قیادت کی سرپرستی میں اپنے مدمقابل تہذیب کے قدیم اقدار کو مٹانے کے در پے رہی ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف پروفیسر ہنٹنگٹن نے اپنے جانب دارانہ رویے کے باوجود اپنی تصنیف میں دبی زبان سے کیا ہے اسی نوع کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے قریب سو سال پہلے اسپلنگلز نے اپنی کتاب "زوال مغرب" میں اشارہ کیا تھا۔ تہذیبی تصادم کا تصور وہ حقیقت ہے جس کا وجود پروفیسر ہٹنگٹن کی شہرہ آفاق تصنیف کی رونمائی سے صدیوں قبل کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ تہذیبی تصادم محض اس شکل میں ظہور میں نہیں آتا کہ دو ملک آپس میں متصادم ہو جائیں۔ بلکہ ایک جغرافیائی حدود میں نشو نما پانے والی دو تہذیبیں بھی آپس میں متصادم ہو سکتی ہیں۔ ہٹنگٹن نے تہذیب کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں آئندہ رونما ہونے والے عالمی تنازعات کے لیے تہذیبی شناخت کو اصل محرک قرار دیا ہے اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغربی اور غیر مغربی تہذیبوں کے درمیان تنازعات کی پیشن گوئی کی ہے۔

"یہ میرا قیاس ہے کہ اس نئی دنیا میں تنازعات کا بنیادی ماخذ نظریاتی یا اقتصادی وجوہات نہیں ہوں گی۔ انسانوں کے مابین ایک بڑی تقسیم اور تنازعہ کا سب سے بڑا محرک ثقافتی ہوگا۔ قومی تشخص کا

---

بلاقی پورہ، مئو۔ یوپی۔

عالمی امور میں سب سے بڑا کردار ہوگا۔لیکن عالمی سیاست میں بنیادی تنازعات اقوام اور مختلف تہذیبی گروہوں کے مابین ہونگے ۔تہذیبوں کا تصادم عالمی سیاست پر حاوی ہو جائے گا۔تہذیبوں کے مابین کھینچی غلط لکیریں مستقبل میں جنگی لکیریں بن جائیں گی''۔(تہذیبی تصادم،ص،۲۵،بحوالہ جامعہ شمارہ جنوری،ص،۶۷)(۱)

غدر ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور سیاسی بساط پر شکست کھا جانے کے بعد ہندوستانی معاشرہ کا نظام زیست اور تہذیبی اقدار جس طرح تغیر سے دوچار ہوا۔وہ ہندوستانی معاشرتی تاریخ کا المناک باب ہے۔مغربی تہذیب کے بال و پر پھیلا لینے کے بعد ہندوستان کا قدیم سرمایہ حیات، مذہبی تصورات، اخلاقی معیار اور قدیم طرز احساس پر مبنی سبھی اثاثے مغرب سے درآمد ثقافتی سیلاب کی زد میں آ گئے تھے۔ اس تہذیبی شکست و ریخت کا احساس سماج کے ہر طبقے کو تھا لیکن حساس ترین افراد یعنی شعرا و ادبا نے اسے شدت سے محسوس کیا۔اس عبوری دور میں تہذیبی آویزش اور ذہنی کشمکش کا جو ردعمل اکبرالہ آبادی کی شاعری میں ملتا ہے،اس کی مثال اور انداز اقبال وشبلی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔اکبر کی شاعری فنی اور فکری لحاظ سے ارفع واعلی نہ سہی لیکن مقصدیت سے پر اور عام فہم ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ان کی شاعری میں ایک سماجی اصلاحی مقصد جلوہ گر ہے۔ان کا پورا کا پورا ذخیرہ اشعار ایک محدود دائرے میں مشرقیت اور مغربیت کے عنوان سے معروف دو تہذیبوں کے درمیان گردش کرتا دکھائی دیتا ہے۔اکبر کے اپنے خیالات کے برملا اظہار میں سرکاری ملازمت سدراہ بنی ہوئی تھی۔جس کی وجہ سے ملازمت کے اصولوں کا پاس ولحاظ اور باز پرس سے بچنے کے لیے انہوں نے طنز وظرافت کا راستہ اختیار کیا۔ اکبر نے اپنے عقل وشعور کا برمحل استعمال کرتے ہوئے طنزیہ لب ولہجے میں جس طرح گفتگو کی وہ کوئی کار فضول نہیں تھا۔وہ اس امر سے پوری طرح واقف تھے کہ تہذیب وثقافت کی نئی جنگ اب شمشیر و سناں سے نہیں بلکہ مغرب کے جدید ذہن سے علمی انداز میں لڑنی ہے۔اکبر کی شاعری کا یہ مطلب قطعی نہ تھا کہ شعر وسخن سے محفل کو زعفران زار بنا دیا جائے۔ بلکہ وہ طنز کے تیر ونشتر سے قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جگانا چاہتے تھے۔

> ''وہ (اکبر) ہنستے ہنساتے ہیں لیکن اس ہنسنے اور ہنسانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اکبر میں سنجیدگی نہیں یا انہیں اخلاق وتمدن کے مسائل سے گہری دلچسپی نہیں۔وہ جو

کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل پر گزری ہے وہ ہنستے ہیں تو اس لیے کہ وہ رو نہ پڑیں''۔

(اردو شاعری پر ایک نظر از کلیم الدین احمد، ص ۸۸، ۸۷)(۲)

طنز و ظرافت سے قطع نظر ان کی شاعری میں جس تہذیبی برتری، اسلامی اقدار کی تقدیس و دل فریبی کی لذت ملتی ہے، اس نوع کا احساس صرف اقبال، حالی اور شبلی میں دیکھنے کو ملتا ہے، اکبر نے اپنے عہد کے مسلم معاشرے کو جو محکوم اور مغلوب ہونے کے بعد احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا، قدیم اسلامی تہذیبی اقدار اور اخلاقی و روحانی روایات کا احساس دلا کر احیائے نو کی سعی کے ساتھ ایک نئی تہذیب کے ساتھ معاشرے میں ظہور پذیر تغیرات کو اپنی حساس مزاجی کے سہارے اپنی کاوشوں میں نمایاں کر کے قوم کو متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کی شاعری پر پروفیسر آل احمد سرور نے کچھ اس طرح تبصرہ کیا ہے۔

''ہمارے لیے اس اعتبار سے ایک قابل قدر تحفہ ہے کہ یہاں انیسویں صدی کے آخر اور جنگ عظیم کے بعد کے تقریباً پچاس برس کی تہذیبی زندگی کا مکمل نقشہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب پہلی دفعہ نئے اور پرانے زمانے کی کشمکش ایک واضح رنگ اختیار کرتی ہے۔ اکبر اس معنی میں اپنے دور کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں اس زندگی کا ہر پہلو محفوظ ہو گیا ہے''۔ (تنقید کیا ہے، ص ۶۸)(۳)

اکبر کا عہد فکری آشوب کے ساتھ ساتھ تہذیبی تصادم سے دو چار تھا۔ یہ عہد تین تہذیبوں ہندو، اسلام اور مغربی تہذیب کی باہمی کشمکش کا مثلث تھا۔ یہ تہذیبی اضطراب فکر و نظر میں نمایاں ہو کر خاص و عام کو متاثر کر رہا تھا۔ ثقافتی کشمکش کو پیش کرنے کے لیے اکبر نے جن الفاظ اور اصطلاحوں کا انتخاب کیا وہ اپنے روایتی معنے کے ساتھ ساتھ تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں۔ مسجد و کلیسا، شیخ و برہمن، گائے اور اونٹ، میم (برطانوی خاتون) گورا، کالا جیسے الفاظ کا لغات میں موجود معنی و مفہوم سے ہٹ کر ان کی شاعری میں ایک دوسرا ہی تہذیبی کردار ہے۔ اکبر کو مغربی تہذیب سے جتنی پرخاش ہے ویسا اظہار ہندو تہذیب کے لیے نہیں ہوا ہے۔ ہندو تہذیب کے لیے نہ نفرت ہے اور نہ ہی عصبیت دراصل انہیں ہندو تہذیب سے کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ اسلام اور ہندو تہذیب کا تعلق مجبور اور محکوم قوموں سے تھا۔ جبکہ مغربی تہذیب اپنے برطانوی حکمرانوں کی سرپرستی میں ہندوستانی عوام کے ذہن و شعور پر

اپنا نقش چھوڑتی چلی جارہی تھی۔ مغرب سے درآمدشدہ زبردست ثقافتی سیلاب اور ذہنی مرعوبیت ہندو مسلم تہذیبی اقدار کو جس طرح بہالے جانے کو آمادہ تھا۔ اکبر نے اسے شدید تنقید کا موضوع بنایا۔ در اصل وہ دونوں تہذیبوں کے مابین اتحاد کے متمنی تھے ؎

اگر دعوی یک رنگی کروں ، ناخوش نہ ہو جانا    میں اس آئینہ خانہ میں ترا عکس مقابل ہوں
یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں    اگر مجھ سے کوئی پوچھے، کہوں دونوں کا قائل ہوں

آب زمزم سے کہا میں نے ملا گنگا سے کیوں    کیوں تیری طینت میں اتنی ناتوانی آگئی
وہ لگا کہنے حضرت آپ دیکھیں تو ذرا    بند تھا شیشی میں اب مجھ میں روانی آگئی

یہاں شیخ و برہمن، اسلامی اور ہندو تہذیب کی نمائندگی کرنے والے تقدیس کے حامل افراد ہیں۔ آب زم زم اور بہتی ہوئی گنگا بظاہر دونوں کا تعلق پانی سے ہے لیکن پانی کے علاوہ وہ اپنا علاحدہ تہذیبی وجود بھی رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تقدیس کے حامل بھی ہیں اکبر نے اپنے کلام میں ان علامات اور استعارات اور تعلیمات کے ذریعے معاشرتی مسائل اور عصری حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اکبر کو طنز و مزاح کے شاعر کی حیثیت سے ایک خاص دائرے میں محدود کرنے کی وجہ سے ان کی شاعری کا جاگیردارانہ نظام اور صنعتی برتری کی مخالفت کا پہلو نمایاں نہ ہوسکا۔ ”گاندھی نامہ“ اکبر کی مشہور نظم ہے جہاں مہاتما گاندھی اور اکبر کے فکری سرچشمے باہم ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکبر کی پسندیدہ شخصیات میں سے ایک موہن داس گاندھی بھی تھے جن کی دلکش شخصیت نے اکبر کو بڑی حد تک اپنی طرف راغب کیا۔ دراصل گاندھی نامہ اکبر کے زمانے میں سیاسی سطح پر جاری مختلف مراحل کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ اکبر نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ بہت سارے لوگ سرکاری ملازمت میں پھنس چکے ہیں۔ یقیناً ایک خوبصورت تنخواہ انسان کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ اکبر حکومت کے ملازم نہ ہوتے تو گاندھی جی کے قریبیوں میں ہوتے۔ گاندھی نامہ کے کچھ اشعار کا تعلق وقت کے اہم واقعات سے ہے۔ (۴)

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں    گو مشت خاک ہیں، مگر آندھی کے ساتھ ہیں

بدھو میاں کا یہ علامتی کردار کسی خاص شخص کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کردار کو مولانا محمد علی جوہر کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ لفظ جدید تعلیم یافتہ

مسلمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ اشعار جن میں بدھو کا علامتی کردار ہے ؎

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں ینگ بدھو وارث اسلام ہیں

مسجد میں شیخ صاحب، گرجا میں لاٹ صاحب بدھو فلاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں

اکبر نے اس کردار کی علامتی حیثیت کو ذیل کے اشعار میں اور بھی واضح کردیا ہے ؎

بدھو کا لفظ تھا فقط ایک مصلحت کی بات دل میں مرے نہاں ہے جو میرے جی کی بات

بدھو سے صرف ہند کا مسلماں مراد ہے مقصود عاجزی ہے، غرور ایک فساد ہے

اکبر اسلامی اور ہندو تہذیب کے مابین تصادم کے قائل نہیں ہیں بلکہ یگانگت اور اتحاد کے خواہشمند ہیں۔ انہیں ہندو فکر و تہذیب سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی ساری شکایت مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید اور مغربی تعلیم کے نقائص سے ہے۔ کیونکہ اس تعلیمی نظام میں آیندہ نسلوں کی ذہنیت اور عقیدے کو نشانے پر رکھا گیا ہے۔ ذیل کے فارسی تضمینی اشعار میں مطلب برآری کے لیے جس طرح مصرعے کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے ان کے ذہن و مزاج کی عکاسی ہوتی ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرادر کار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اکبر نے اس شعر میں اس طرح تضمین کی ہے۔

جب کہا ختنہ کو تو طفل مسلماں نے کہا کافر عشقم مسلمانی مرادر کار نیست

جب جنیو کو کہا طفل برہمن بول اٹھا ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

ختنہ اور جنیو اسلامی اور ہندو تہذیب کے وہ بنیادی عمل ہیں۔ جن کے بغیر ہندو اور مسلمان کا تصور بہت حد تک مشکل ہے لیکن اکبر کے یہاں یہ دونوں عمل باہم شیر و شکر ہوگئے۔

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں اغیار ان پر گذرتے ہیں اب خندہ زناں

جھگڑا کبھی گائے کا، کبھی زباں کی بحث ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں

گائے کا تقدس اور احترام ہندو تہذیب اور معاشرے میں گویا عقیدہ ہے اور اردو اور ہندی کا لسانی تنازعہ پیدا کرنا دونوں کے مابین تصادم کے لیے راہ ہموار کرنا تھا:

یہ بات غلط کہ دارالسلام ہے ہند یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند

ہم سب مطیع و خیر خواہ انگلش یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

یہاں دارالسلام اور ملک پچھمن ورام کا ذکر ہے۔دارالسلام کی اصطلاح خالص اسلامی فقہی بحث ہے۔جب کہ قدیم ہندو اساطیر میں پچھمن ورام کو ایک مقدس و محترم مقام حاصل ہے۔اکبر نے یہاں پر دونوں کی نفی کی ہے۔جب کہ انگریزی حکومت کے ذریعے ہندوستان کے قدرتی وسائل پر قبضہ سے اقتصادی منفعت حاصل کرنے کو طنزیہ پیرائے میں اور ہندو و مسلم دونوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ہندوستان کو یورپ کے لیے گودام کیوں کہا؟اس کا صحیح جواب پانے کے لیے ہمیں P.E.Robert کے الفاظ سے مدد ملتی ہے۔(۵)

"The products of Indian soil and craftsmanship were from time immemorial well known in western mart."(History of brirish Indian Oxford university press London.1952 P-14)

''ہندوستانی سرزمین اور دستکاری مصنوعات مغربی بازار میں عہد قدیم سے مشہور تھیں۔''

اکبرالہ آبادی کی شاعری انگریزوں کے اسی طریقہ کار اور اقتصادی استحصال کے خلاف احتجاج ہے۔انھوں نے محسوس کیا کہ مغربی تہذیب اور تعلیم نوجوان نسل کو مذہبی امور سے بیگانہ اور قدیم تہذیبی روایات سے نہ صرف برگشتہ کر رہی ہے بلکہ پورے ملک کو اقتصادی نقطۂ نظر سے بے دست و پا بھی کر رہی ہے۔اکبر اپنے قدیم روحانی اور اخلاقی سرمائے کا مادی ترقی اور معاشی خوشحالی کے عوض سودا کرنے کے لیے قطعی تیار نہ تھے ؎

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ پیدا ہوگی خطِّ نسخ سے شان ادب آگیں — نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہوں گے
عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے — مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے — کتابوں میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

اکبر جب مغربی تعلیم و تہذیب کے منفی اثرات سے قوم کو آگاہ کرتے ہیں تو ان کا روئے سخن زیادہ تر مسلمانوں کی طرف ہوتا ہے۔وہ مسلمانوں کے اندر فروغ پا رہی مغرب کی اندھی تقلید سے

سخت متنفر تھے۔ اکبر کو اپنی تہذیب، تاریخی روایات، مذہبی معتقدات اور نظام زندگی کی شکست و ریخت پر سخت افسوس تھا۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اسلام میں جہاں عورتوں کو اپنے گھروں میں قرار کے ساتھ رہنے۔غیر مردوں کو بناؤ سنگھار دکھانے سے منع کیا گیا ہے، وہیں مردوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا بھی حکم ہے۔لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر بے پردگی جب عام ہونے لگی۔تو اکبر نے مسلمان عورتوں کو غیرت دلاتے ہوئے مسلم مردوں کی بے حسی پر بھی تنقید کی ہے اور اس بے راہ روی کے لیے دونوں کو یکساں ذمہ دار ٹھہرایا۔

درحقیقت اکبر جدید سائنس اور تعلیم کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کو انگریزوں اور مغربی تہذیب کی نقالی پر اعتراض تھا۔کلچر اور مذہب سے متعلق معاملات میں مغرب کی تقلید کو انھوں نے ہدف تنقید بنایا۔مذہب اور مذہبی شعائر کو مغرب کے معیار پر جب پرکھا جانے لگا اور تجدد پسندی اور روشن خیالی کے نام پر مذہب بیزاری کو راہ دی جانے لگی تو اکبر کا لہجہ شدید سے شدید تر ہونے لگا ؎

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ ادھر صورت فقیرانہ ادھر صورت سامان شاہانہ
چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر، اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

---

شیطان عربی سے ہے ہند میں بے خوف لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

---

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

---

اگر مذہب خلل انداز ہے ملکی مقاصد پر تو شیخ و برہمن پنہاں رہیں دیر و مساجد پر

ظاہری کچھ مذہبیت اور باقی سارے اطوار مغربی، یہ تضاد عمل اکبر کے نزدیک اونٹ پر بیٹھ کر تھیٹر جانے جیسا ہے، اکبر کی نظر سے یہ کیسے رہ جاتا؟

مذہبی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر پر چلے ہیں حضرت

اکبر الہ آبادی اور سرسید احمد خاں دونوں ہم عصر تھے۔سرسید کے زیر اثر نئی نسل انگریزی تعلیم

کی طرف متوجہ ہوئی تو انگریزوں سے ذہنی مناسبت اور مفاہمت کے لیے اسلامی اعتقادات کی طرح طرح کی توجیہیں کی جانے لگیں بلکہ ان کی ذہنی غلامی کو انتہائے کمال سمجھا جانے لگا۔ اکبر کو یہ روش اچھی نہ لگی ؎

سید جو گزٹ کے لیے نکلے تو لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتا پھرا ، پیسہ نہ ملا

بادہ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم　　ایشیا کے شیشۂ تقوی کو کر دو پاش پاش

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات　　افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے کہ تجھ پہ دین کی اصطلاح فرض ہے　　میں چل دیا یہ کہہ کے آداب عرض ہے

ایک نظم میں ایک واعظ کا خیالی مکالمہ بھی ملاحظہ ہو ؎

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا　　چرچا ہے جابہ جا تیرے حال تباہ کا

سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا　　دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الہ کا

ہے تجھ سے ترک صوم وصلوۃ وزکوۃ وحج　　کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا

شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر　　بندہ بنا دیا ہے تجھے حب جاہ کا

اس کا جو جواب ملتا ہے وہ ہے بڑا تکلیف دہ:

اس نے جواب دیا مذہب ہو یا رواج　　راحت میں جو مخل ہے وہ کانٹا ہے راہ کا

کبھی کبھی سرسید پر تنقید کرتے ہوئے اکبر کا لہجہ سخت ہو گیا ہے لیکن یہ اختلاف رائے ہی تھا ورنہ اکبر کا یہ مصرعہ پوری حیات جاوید کا خلاصہ بن گیا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا۔

برق کلیسا: یہ نظم ۱۹۳۰ء کی ہے لیکن اس کی تازگی اب بھی برقرار ہے، یہ نظم غزل کے روایتی انداز میں ہے۔ نظم میں مس کی شکل میں مغربی تہذیب کی نمائندگی ہے جبکہ مشرقی تہذیب کا نمائندہ شاعر اپنے نحیف ولاغر جسم اور ایمان ویقین کی دولت سے عاری وجود کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہے۔ ان دونوں کا انداز دیکھیے ؎

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں کھولی　　ناز و انداز سے تیور کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے　　بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر حملے سرحد پر کیا کرتے ہیں غازی بن کر
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیوں کر یہ ہیں ننگ نہاد ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

یہی وہ عہد تھا جب یورپ میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عہد میں دائیں بازو کے شدت پسندوں کو عروج حاصل ہوا تھا۔ اور مغرب کا ایک عام آدمی اسلام کو دہشت و وحشت کا سبب قرار دے رہا تھا۔ دور حاضر میں پھر یہی سوچ زیادہ طاقتور بنا دی گئی ہے۔ اسلاموفوبیا نے یورپ سمیت پورے عالم کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس نے قومیت اور غیر ملکیوں سے نفرت (xonophobia) کے انتہا پسند نظریے کی آگ کو اور ہوا دی ہے۔ اسلاموفوبیا مسلمانوں کے ساتھ بلا واسطہ یا بالواسطہ تعصب، نفرت اور تشدد کی الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ان سارے فکری عوامل کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جن سے تہذیبی تصادم کا ماحول تیار ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں ہم جس اسلاموفوبیا سے روشناس ہوئے ہیں وہ سارے عنصر اس نظم میں موجود ہیں۔ شاعر جو دراصل مسلم تہذیب کا نمائندہ ہے اس نے اپنے فکری شعور کا استعمال کر کے اعتذارانہ جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے ؎

ہم میں باقی نہیں اب خالد جاں باز کا رنگ دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرہ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ سب کے سب آیت ہی پڑھتے رہیں سبحان اللہ
جوہر تیغ مجاہد تیرے ابرو پہ نثار نور ایماں کا تیرے آئینہ رو پہ نثار
اٹھ گئی صفحہ حاضر سے وہ بحث بد و نیک دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موج کوثر کی کہاں اب ہے میرے باغ کی گرد میں تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم تو نکالو دل نازک سے یہ شبہہ یہ وہم
میرے اسلام کو ایک قصہ ماضی سمجھو ہنس کے بولی تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اکبر کی شاعری ان کے عہد میں برپا تہذیبی شکست و ریخت روح عصر بن کر نمایاں ہو کر

ابھرتی ہے۔اپنے وقت کی مجموعی سیاسی اور تہذیبی فضا کو اکبر نے اپنی شاعری میں خوبصورتی کے ساتھ طنزیہ لب و لہجے میں پیش کرنے کی ایک جداگانہ ومنفرد اور کامیاب کوشش کی۔

مغربی تہذیب کا دائرہ وسیع ہوا یا تنگ؟ اس سوال سے قطع نظر ہندوستان کا موجودہ منظر نامہ کچھ اور ہی صورت دکھا رہا ہے۔ہنٹنگٹن نے لکھا ہے:

برصغیر میں ہندو مسلمانوں کا تاریخی تصادم اب نہ صرف ہندوستان کی باہمی رقابت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔بلکہ خود ہندوستان کے اندر بڑھتے ہوئے جنگ جو گروہوں اور ہندوستان کی مسلم اقلیت کے بین شدید تر ہوتے ہوئے مناقشے کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔(تہذیبی تصادم،ص ۴۳، ۴۴ بحوالہ جامعہ شمارہ جنوری،ص ۷۶)

آج ضرورت ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کے مفروضے کو بالائے طاق رکھ کر تہذیبوں کے مابین مکالمے کی فضا ہموار کی جائے۔تہذیبی شناخت اور انفرادی تشخص ہندوستان کے اتحاد اور ترقی میں مخل نہ ہو بلکہ ایک زبردست قوت بن کر ابھرے۔ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کا تنوع دنیا کے لیے ایک مثال بنے۔تاریخ کے اس موڑ پر اب جب کہ ہندو اور مسلم دونوں تہذیبیں باہم دست وگریباں ہونے کو ہیں اکبر الہ آبادی کی شدت سے یاد آرہی ہے لیکن ڈھونڈھنے سے کوئی اکبر دکھائی نہیں دیتا ہے اور اب تو وہ الہ آباد بھی باقی نہیں رہا ؎

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ بہت نزدیک ہیں وہ دن جب تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

---

## حواشی

(۱) تہذیبی تصادم/ص:۲۵/بحوالہ جامعہ شمارہ جنوری/ص:۷۶۔(۲) اردو شاعری پر ایک نظر اور کلیم الدین احمد/ص:۸۷-۸۸۔(۳) تنقید کیا ہے؟ از پروفیسر آل احمد سرور،ص:۶۸۔(۴) Akbar's anti-Imperialist poetry in polilico cultral prespeclives,by mohdAsif Qadri, page-3

(۵)History of british Indian۔(۶) تہذیبی تصادم،ص ۴۳، ۴۴،بحوالہ جامعہ شمارہ جنوری،ص ۷۶۔

# غالب سے متعلق سوانحی تصانیف:

## ایک مختصر تجزیاتی مطالعہ

جناب محمد راشد اقبال

اردو میں سوانح نگاری کے بنیاد گزاروں میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام سرفہرست ہے۔انھوں نے اپنی تصنیفات سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ان کی پہلی تصنیف شیخ سعدی شیرازی کی سوانح عمری ''حیات سعدی'' ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۶ء مطابق ۱۳۰۳ھ میں مطبع انصاری، دہلی سے شائع ہوئی۔(۱)

''حیات سعدی'' کے بعد حالی کی دو اور سوانحی تصانیف ''یادگار غالب'' اور دوسری ''حیات جاوید'' کے نام سے شائع ہوئیں۔

''یادگار غالب'' غالب کی اولین سوانح حیات ہے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں پہلی بار نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی۔کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ ایک سو پانچ صفحات کا غالب کے احوال وکوائف کے بیان پر ہے، دوسرا حصہ تین سو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالب کی اردو اور فارسی شاعری ومضامین نثر کا انتخاب مع تشریح وتبصرہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں مرزا کے کلام کا موازنہ ایران کے مسلّم الثبوت شاعروں مثلاً نظیری اور ظہوری کے کلام سے کیا گیا ہے۔مرزا کی نثر کا موازنہ شیخ علی حزیں اور ابوالفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں انیس صفحات پر مشتمل ''خاتمہ'' ہے، جسے حالی کے بقول:

''ساری کتاب کا لب لباب سمجھنا چاہیے''۔(۳)

---

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

''یادگار غالب'' کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے غالب سے متعلق احوال و کوائف کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے۔ جب کہ ان کے کلام کی خوبیوں پر زیادہ توجہ کی ہے۔ جب کہ غالب کی عبقری شخصیت مفصل سوانح کی متقاضی تھی۔

مولانا الطاف حسین حالی ''یادگار غالب'' کی ترتیب سے متعلق وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔''(۳)

مولانا الطاف حسین حالی نے ''یادگار غالب'' میں مرزا کی تصانیف، ان کے عزیز و اقارب کی معلومات اور ذاتی واقفیت کو مدنظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی ''یادگار غالب'' سے متعلق لکھتے ہیں:

''یادگار غالب'' غالب کی اولین مستقل سوانح عمری ہے۔ بہ لحاظ سوانحی موضوع، غالب کی شخصیت، اہمیت، انفرادیت وغیرہ کے سوانحی نظریات و تصورات کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ حالی کے غالب سے تعلقات بھی مواد کی فراہمی کے لیے بہت ہی مفید و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جو غالب کی ایک طویل مبسوط اور مفصل سوانح عمری کی طالب تھیں، حالی نے ایک مختصر سیرت لکھنے پر اکتفا کیا۔ غالب کی حیات کو ضمنی حیثیت دی۔ اور ان کے کارناموں اور ملکۂ شاعری کی وضاحت پر زیادہ توجہ صرف کی اور بحیثیت سوانح نگار اپنے فرائض کو پوری طرح ادا نہیں کیا۔ حالی نے خود کو ان چار چیزوں تک محدود رکھا ہے۔ جن کے پیرائے میں مرزا کا عجیب و غریب ملکہ ظاہر ہوتا یعنی نظم ونثر، ظرافت اور بذلہ سنجی، عشق بازی اور رند مشربی اور حب اہل بیت اور یہ امید کی ہے کہ ان سے مرزا کی شاعری پر جو توبہ تو

پردے پڑے ہوئے ہیں ان کے مرتفع ہونے میں مدد ملے گی لیکن ان میں بھی سوااول الذکر کے کسی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔‘‘(۴)

’’یادگار غالب‘‘ پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ حالی نے احوال وکوائف کے بیان میں مکمل وضاحت نہیں کی ہے اور حق تحقیق کو ادا کرنے سے گریز کیا ہے۔ جب کہ انھیں غالب سے نسبت شاگردی حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے انھیں مفصل سوانح حیات لکھنے کے بہترین مواقع میسر تھے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقم طراز ہیں:

’’غالب کی حیات اور شخصیت کے بارے میں بھی ’’یادگار غالب‘‘ میں بہت کچھ تفصیل پائی جاتی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ حالی کا یہ مقصود نہیں تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے انھوں نے اس خصوص میں دل چسپی لی بلکہ بعض جگہوں پر غالب کی شخصیت کی پردہ داری کرتے ہوئے حق تحقیق بھی ادا نہیں کیا۔ مثلاً ایرانی نژاد، عبدالصمد کے بارے میں ان کا رویہ۔‘‘(۵)

پروفیسر آل احمد سرور اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’حالی نے غالب اور سرسید کا ایک حد تک پردہ رہنے دیا۔ مگر اس معاملے میں حالی مجبور تھے۔ حالی نے یہ کتابیں جس زمانے میں لکھی تھیں اسی زمانے میں لوگ بعض حقیقتوں کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ ہر دور کی طرح اس دور کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں۔ آج اگر یہ ثابت ہو جائے کہ غالب واقعی جوا کھیلتے تھے تو اس سے غالب کی عظمت پر کوئی حرف نہ آئیگا۔ مگر انیسویں صدی اس قدر روادار نہیں تھی۔ وہ صرف فرشتہ صفت لوگوں کو ہیرو بتاتی تھی۔ انسانی کمزوریاں ان کے نزدیک قابل معافی نہ تھیں‘‘۔(۶)

ممکن ہے کہ حالی نے اسی بنا پر اپنے ہیرو کی کمزوریوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے سے اجتناب کیا ہو اور ان کی انفرادیت وامتیازات پر ساری توجہ صرف کی ہو۔ وجہ جو بھی ہو لیکن حالی سے لاکھ اختلاف کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کی سوانح اور تنقید سے متعلق اولین بنیادیں انھیں کی رکھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ’’یادگار غالب‘‘ کی شکل میں جو ابتدائی سوانحی اور تنقیدی مواد پیش کیا ہے اس کی قدر و قیمت آج بھی مسلّم ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ

کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"اگر یادگار نہیں لکھی جاتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ غالب شناسی کے باقاعدہ ڈسکورس کو شروع ہونے میں مزید کتنی مدت درکار ہوتی۔ حالی نے مرزا کی حیات وشخصیت، اخلاق وعادات معاصرین واحباب واعزہ وتلامذہ پر بھی جم کر لکھا۔ محاسن شعری کا بھی نہایت دلجمعی سے جائزہ لیا۔ اور ریختہ وفارسی شاعری کا بہترین انتخاب بھی پیش کیا۔ علاوہ ازیں مرزا کی جملہ نثر نگاری کا بھی منصفانہ احاطہ کیا اور خطوط نگاری کے خصائص کو بھی اس عمدگی سے نشان زد کردیا کہ کوئی ان سے بہتر نہیں لکھ سکا۔ آج ہم نقد غالب میں حالی سے لاکھ اختلاف کریں، مرزا کے بارے میں بہت سے مسائل ومباحث کی بنیادیں انھیں کی رکھی ہوئی ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ نئے نکات کی بحث بھی اگر نکلتی ہے تو انھیں سے نکلتی ہے"۔(۷)

"یادگار غالب" کی اشاعت کے تقریباً انتالیس سال بعد ۱۹۳۶ء میں غالب کے سوانح سے متعلق دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں پہلی مولانا غلام رسول مہرؔ کی "غالب" اور دوسری شیخ محمد اکرام کی "غالب نامہ" ہے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ کی "غالب" پہلی بار ۱۹۳۶ء میں مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور مجموعی ضخامت ۳۷۸ صفحات کی ہے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ نے "غالب" کی اشاعت اول کی "تمہید" میں غالب سے اپنے عقیدت و محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"دیوان غالب پڑھا تو دل میں وہ جذبۂ عقیدت ونیاز پیدا ہوا۔ جسے اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ اب بھی اپنے ذوق ادب کے کلبۂ تاریک کی شمع فروزاں سمجھتا ہوں۔ میں اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور چلا آیا۔ کالج میں پہنچ کر میں نے مولانا حسرت موہانی کی شرح غالب دیکھی جس نے غالب کی ذات کے ساتھ حسن عقیدت اور جوش نیاز کے اس جذبہ کو زیادہ محکم وپختہ کردیا"۔(۸)

مولانا غلام رسول مہرؔ نے غالب کی سوانح حیات کو مرتب کرنے میں مرزا کی تحریروں مثلاً

خطوط، نظم ونثر اور دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ''غالب'' کی ترتیب سے متعلق رقم طراز ہیں:

''انھوں نے غالب کے مکاتیب اور دیگر تحریروں وغیرہ سے اقتباسات لے کر انھیں اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ غالب کی اچھی خاصی سوانح تیار ہوگئی ہے چونکہ یہ تحریریں غالب کی اپنی ہیں اس لیے اسے غالب کی ''خودنوشت سوانح'' بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالب کے کئی ایک سوانح حیات لکھے جانے کے باوصف غلام رسول مہر کی اس سوانح کو جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی آج بھی غالبیات میں ایک اہم اور ممتاز مقام حاصل ہے''۔(۹)

ڈاکٹر شفیق احمد کے یہ خیالات بھی ''غالب'' کو سمجھنے میں معاون ہیں:

''تفہیم غالب کا باقاعدہ آغاز ''یادگار غالب'' سے ہوا تھا۔''یادگار غالب'' میں نہ صرف مرزا غالب کے کلام پر تنقید وتبصرہ کیا گیا تھا بلکہ غالب کی حیات کو بھی موضوع بنایا گیا تھا۔لیکن چونکہ مولانا حالی کے نزدیک غالب کی زندگی میں کوئی ایسا پہلو موجود نہیں تھا جو زوال آمادہ قوم کو راہ ترقی کی جانب گامزن کرنے میں معاون ہوسکتا،لہٰذا انھوں نے یادگار غالب میں سوانحی پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی تھی۔جس کی بنا پر یہ حصہ بہت حد تک تشنہ رہ گیا تھا۔غالباً اسی کے پیش نظر مولانا مہؔر نے غالب کے سوانحی حالات مرتب کرنے کا مشکل فریضہ انجام دینے کی کوشش کی۔ان کی یہی کوشش ''غالب'' کی شکل میں مرزا کے مداحوں کے سامنے ہے۔صرف ذخیرۂ غالبیات ہی نہیں بلکہ مولانا مہر کی یہ تصنیف اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے''۔(۱۰)

البتہ ڈاکٹر شفیق احمد کا مطالعہ کچھ اور بھی کہتا ہے:

''غالب'' میں بطور سوانح عمری نمایاں اوصاف کے ساتھ ساتھ کچھ نقائص بھی ہیں۔مثلاً اس کا سب سے بڑا نقص تو یہی ہے کہ جذبات عقیدت ومحبت کے باعث غالب کی شخصیت کے بعض نمایاں معائب کو پیش کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔مثلاً

معلوم ہے کہ مرزا غالب بعض اوقات امرا و رؤسا کو خوش کرنے کے لیے ان کی بے جا تعریف کر دیتے تھے، لیکن مولانا مہرؔ نے شخصیت کے اس پہلو کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ ابوالکلام آزاد کی طرف سے تحریری طور پر اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانے کے باوجود وہ مرزا کی شخصیت کا یہ رخ گول کر گئے، حالانکہ یہ سب باتیں مرزا کی اپنی عبارات میں اندرونی شہادتوں کے طور پر موجود ہیں۔طنز و مزاح مرزا غالب کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔صرف کلام ہی نہیں بلکہ وہ عام زندگی میں بھی ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں، لیکن ''غالب'' میں مرزا کی شخصیت کے اس پہلو کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

''غالب'' کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں اکثر جگہ تکرار کا احساس ہوتا ہے۔یہ تکرار یقیناً مولانا مہر کے قلم کا نتیجہ نہیں۔لیکن مولانا آزاد سے تعلقات کے باعث انھوں نے اکثر مقامات پر غالب کے بارے میں ان کی جو تحریریں شامل کر دی ہیں وہ تکرار کا باعث بنتی ہیں۔ان تحریروں کی وجہ سے جہاں بسا اوقات مولانا مہر کے پیش کردہ دلائل کی تائید ہوتی ہے اور کچھ نئی تفصیلات سامنے آ جاتی ہیں، وہیں بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مولانا مہر کے پیش کردہ نتائج کا استرداد ہو جاتا ہے۔یہی وہ مقامات ہیں جہاں قاری چکرا جاتا ہے۔اس لیے کہ وہ کسی واضح اور متعین نتیجے تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس قسم کی سب سے نمایاں مثال قمار بازی کے الزام میں غالب کی گرفتاری اور اس پر بادشاہ سمیت روسائے دہلی کے تاثرات ہیں۔''غالب'' کا ایک نمایاں نقص یہ ہے کہ اس میں سوانحی واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا ہے، مثلاً غالب کے پانچویں اور چھٹے ابواب کے عناوین بالترتیب ''سفر کلکتہ'' اور ''رام پور اور میرٹھ کا سفر'' ہیں لیکن خود مولانا مہر کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب کو پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر ۱۸۲۷ء میں پیش آیا تھا۔جب کہ وہ میرٹھ اس وقت گئے تھے جب ۱۸۶۰ء میں نواب شیفتہ کو رہائی ملی تھی۔ان دونوں سفروں میں تقریباً تیس سال کا زمانی فاصلہ ہے۔سوانحی تسلسل کے ٹوٹنے کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۷ء میں پیش آنے والے سفر کا ذکر کرنے کے بعد اگلے باب میں پھر پنشن کے

مقدمے کو موضوع بنایا گیا ہے‘‘۔(۱۱)

غالب سے متعلق تیسری کتاب شیخ محمد اکرام کی ’’غالب نامہ‘‘ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں قومی کتب خانہ، لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ’’حیات غالب‘‘ کے نام سے ہے۔ یہ ایک سونواسی (۱۸۹) صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں غالب کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں۔اس حصے کے آخر میں پندرہ صفحات پر مشتمل ’’خاتمہ‘‘ بھی ہے۔

دوسرا حصہ ’’غالب نما‘‘ کے نام سے ہے۔ یہ دوسو چھ صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے غالب کی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کرکے اردو اور فارسی کے مشاہیر شعراء مثلاً میر تقی میرؔ، سوداؔ، مومنؔ، اقبالؔ، خسروؔ اور فیضیؔ سے غالب کا موازنہ کیا ہے، اوران میں مشترک اور مختلف عناصر کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ۲۰۰۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے شائع شدہ ’’غالب نامہ‘‘ کی مجموعہ ضخامت ۴۱۴ صفحات ہے۔یہی ایڈیشن راقم حروف کے پیش نظر ہے۔

شیخ محمد اکرام نے ’’غالب نامہ‘‘ کی وجہ تصنیف کے اسباب ومحرکات کے بیان میں لکھا:

> ’’ہم تینوں ابھی لاہور میں ہی تھے کہ غالب کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی انگریزی کتاب شائع ہوئی، اسے پڑھ کر ہم سب کے دلوں کو ایک ٹھیس سی لگی، ہم غالب پرست نہیں تھے، لیکن غالب کی عظیم اور دلآویز شخصیت کا جادو ہم پر بھی تھا۔ ہمیں اس کتاب کے بعض حصے بہت تلخ سے معلوم ہوئے۔ ممتاز صاحب کی رائے تھی کہ غالب کے متعلق ڈاکٹر لطیف کی تنقید نقادانہ غیر جانب داری سے عاری اور معاندانہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا چھٹا باب جس میں انھوں نے شاعرانہ عظمت کی مثالیں دی تھیں، پسند نہ تھا۔ اول تو جو مثالیں دی گئی تھیں ان سب کا میں مداح نہیں تھا۔ دوسرے مجھے یہ طرز تنقید بھی عجیب معلوم ہوتا تھا کہ نقاد بجائے اس کے کہ شاعر کے کلام کا حسن وقبح بوجہ خود دیکھے مغربی ادبیات کے چند نمونے مقرر کرلے اور جو نظمیں ان نمونوں کے مطابق نہ ہوں انھیں ناقص قرار دے‘‘۔(۱۲)

ڈاکٹر سید عبداللطیف (پروفیسر انگریزی ادب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) کی یہ کتاب "Ghalib: A Critical appreciation of His life and Urdu Poetry" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں

شائع ہوئی تھی۔جس کا اردو ترجمہ سید معین الدین قریشی ایم۔اے (عثمانیہ) نے ”غالب: حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحسین“ کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں لار پورٹ پریس، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔

شیخ محمد اکرام کو اسی کتاب سے ٹھیس لگی کہ اس میں غالب سے متعلق غیر جانب داری سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ان کے ذہن میں اس کے ردو دفاع میں ایک کتاب کا خیال آیا:

”اور جس میں مولانا حالی کی میانہ روی اور ان کے مقدمۂ دیوان کی بالغ نظری کی پیروی بھی ہو“۔(۱۳)

ان کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ:

”سب سے پہلی چیز غالب کا ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنا تھا۔جس میں واقعات سن وقوع کی ترتیب سے درج ہوں، لطائف وحکایات کی طرح ضمناً نہیں۔غالب کے اردو خطوط اس مقصد کے لیے بہت کارآمد نہ تھے۔اس لیے فارسی کلیات نظم ونثر کا بغور مطالعہ کرنا پڑا، اور جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ غالب کے متعلق جو تذکرہ نگاران کی فارسی تصنیفات کو دھیان میں نہیں رکھے گا وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوگا۔ چنانچہ میں نے مرزا کے فارسی خطوط کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا شروع کیا“۔(۱۴)

غلام رسول مہر اور شیخ اکرام دونوں کی کتابوں کا سال اشاعت ایک ہی ہے، اس ضمن میں یہ حکایت بھی دلچسپ ہے کہ شیخ اکرام کو پروفیسر حمید احمد خاں کے خط سے اطلاع ملی کہ مولانا غلام رسول مہؔر نے بھی ایک کتاب غالب سے متعلق لکھی ہے جو بہت ہی جلد شائع ہونے والی ہے۔اس میں انھوں نے غالب کی سوانح حیات ان کی تصنیفات کی مدد سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔اس اطلاع کے بعد شیخ اکرام کافی فکر مند ہوئے، انھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ان کی کتاب پہلے شائع ہوگئی تو میری محنت رائیگاں چلی جائے گی۔اس لیے کہ دونوں کے مآخذ ایک ہی ہیں۔

چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے تگ ودو میں اضافہ کردیا لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بروقت یہ کام نہیں ہوسکا۔اسی دوران ۲۸/اگست ۱۹۳۶ء کو انھیں مہؔر صاحب کی کتاب ہاتھ آئی، کتاب ملتے ہی انھوں نے پہلی فرصت میں اس کا مکمل مطالعہ کیا۔مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر

پہنچے کہ انھیں اپنی کتاب شائع کردینی چاہیے۔ شیخ محمد اکرام نے مہرؔ صاحب کی کتاب ’’غالب‘‘ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

’’انھوں نے اپنی کتاب میں وہ سوانحی تسلسل برقرار نہیں رکھا تھا جو ایک مربوط اور مکمل تذکرہ کے لیے ضروری ہے، مثلاً انھوں نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں مرزا کے سفر کلکتہ کا ذکر کیا ہے جو میری تحقیق کے مطابق ۱۱؍نومبر ۱۸۲۹ء کو ختم ہوا اور اس کے فوراً بعد پانچویں باب میں رام پور اور میرٹھ کے سفروں کے حالات ہیں جو اس کے قریباً تیس سال بعد یعنی ۱۸۶۰ء میں مرزا کو پیش آئے۔ چھٹے باب میں پھر پنشن کے مقدمہ کی تفصیلات ہیں، جن کا ذکر حقیقتاً سفر کلکتہ کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح مرزا کی زندگی کے کئی اہم حصوں کی نسبت (مثلاً ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء تک) کوئی مسلسل بیان نہیں۔ قلعہ سے تعلقات کا ذکر دو صفحوں سے زیادہ نہیں اور ڈاکٹر لطیف کے اعتراضات کا جواب دینا باقی ہے۔ غالب اور کلام غالب کے متعلق ادبی تبصرہ چند سطروں سے زیادہ نہ تھا۔ غالب کی تصنیفات کے متعلق ان کے اندراجات اکثر غیر مکمل اور کئی جگہ غلط تھے، مثلاً وہ صفحہ ۱۳۹ پر لکھتے ہیں ’’غالباً ۱۸۵۴ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا مکمل ہوا۔ اس کا نام ’’مہر نیمروز‘‘ تھا۔ یہ کتاب جیسا کہ غالب کے دو فارسی خطوں سے پتہ چلتا ہے ۱۸۵۲ء میں ختم ہوگئی تھی۔ ’’مثنوی ابر گہر بار‘‘ کی تاریخ تصنیف کے متعلق مولانا کو کوئی واقفیت نہیں۔ اسی طرح منتخب اردو دیوان کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی نسبت انھیں کوئی اطلاع نہیں۔ مولوی کریم الدین کا اندراج ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ بانکے پور (کذا = بانکی پور) لائبریری میں فارسی دیوان کا جو قلمی اور نہایت پرانا نسخہ ہے اس کے وجود کے متعلق بھی مولانا کو کوئی خبر نہیں۔ مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری کتاب کے دو حصص یعنی ’’تبصرہ‘‘ اور ’’انتخاب‘‘ کو تو انھوں نے چھوا تک نہیں‘‘۔ (۱۵)

اب شیخ محمد اکرام کی ’’غالب نامہ‘‘ سے متعلق پروفیسر گیان چند جین کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''یادگار غالب'' کے بعد شیخ محمد اکرام کی ''آثار غالب'' ایسی کتاب ہے جو سوانح کی تحقیق کے لیے بھی اہم ہے اور تصانیف کی تنقید کے لیے بھی۔اس میں بڑا توازن پایا جاتا ہے۔اکرام نے غالب کی ادبی زندگی کو پانچ دور قرار دیے جن میں تیسرا دور فارسی کا اور پانچواں دور اردو خطوط کا ہے۔ان تمام ادوار کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔اس طرح غالب کا ذہنی ارتقا بھی سامنے آ گیا۔اس کے بعد انھوں نے غالب کی شاعری پر عام تبصرہ کیا جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے۔اس میں غالب کی عشقیہ شاعری، غالب کے فلسفے اور غالب کے مذہب پر گہری نظر ڈالی''۔(۱۶)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید یوں رقم طراز ہیں:

''بجنوری کی پرستش اور ادھر لطیف اور خاص طور پر یگانہ کی غالب شکنی کے باعث اردو تنقید غالب کے تعلق سے عدم توازن کا شکار ہو چکی تھی ۔بجنوری نے غالب کو آسمان پر چڑھا دیا تو یگانہ نے انھیں تحت الثریٰ میں پہنچا دیا۔ادھر بھی انتہا پسندی سے کام لیا گیا اور ادھر بھی شدت سے۔نہ بجنوری نے انصاف سے کام لیا اور نہ لطیف و یگانہ نے ،لطیف اور یگانہ کے ہاں ایک طرح کہہ لیجیے بجنوری کا ردعمل ملتا ہے۔یوں بھی ان دونوں نے بجنوری کا حوالہ بھی دیا ہے۔ایسے میں شیخ محمد اکرام نے ان دونوں انتہاؤں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی اور نسبتاً ایک معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا جس کی بجنوری لطیف اور یگانہ سب کے ہاں کمی پائی جاتی ہے''۔(۱۷)

''غالب نامہ'' کی اشاعت کے تقریباً دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں مالک رام کی ''ذکر غالب'' منظر عام پر آئی۔مالک رام نے اس کو اولاً ''سبد چیں'' کے دیباچے کے طور پر تیار کیا تھا لیکن دیباچہ طویل ہو گیا تو حامد علی خاں (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی) نے اسے الگ ایک کتابی شکل دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ذکر میرے سامنے تھی، اسی کے طرز پر اس کا نام ذکر غالب رکھ دیا گیا۔یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔باقی مالک رام کی زبانی ملاحظہ ہو:

''میں نے یہ مضمون ''سبد چیں'' کے دیباچے کے طور پر لکھا تھا، اسی لیے اس میں میرزا کی زندگی اور تصنیفات کے بیان پر اکتفا کی، اور کلام پر نقد و تبصرہ سے

اجتناب کیا۔ایک تو اس لیے کہ حالی سے لے کر ہمارے زمانے تک متعدد شارحین اور ناقدین میرزا کے کلام کا جائزہ لے چکے تھے۔ دوسرے اس مضمون کو دیباچے کی حدود سے تجاوز کر کے کسی بحث مباحثے یا مناقشے کا میدان نہیں بنانا چاہتا۔حال آنکہ اس میں وقتاً فوقتاً جو اضافے ہوئے ہیں۔اس سے کتاب کی ضخامت چوگنی ہوگئی۔ لیکن کتاب سوانح وسیرت کے دائرے سے باہر نہیں گئی''۔(۱۸)

مالک رام نے ''ذکر غالب'' کو تین حصوں یعنی ''سوانح حیات''، ''تصنیفات'' اور تیسرا ''عادات واخلاق'' کے عنوان سے ہے۔

''سوانح حیات'' ایک سو چھبیس[۱۲۶] صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ترسٹھ[۶۳] ذیلی عنوانات قائم کر کے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور متعدد ذیلی عنوانات کے تحت اپنے پیش رو سوانح نگاروں (مولانا الطاف حسین حالی، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام) کی فراہم کردہ معلومات پر اضافے کیے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ ''تصنیفات'' کے تحت چھیالیس[۴۶] صفحات پر مشتمل ہے۔اس حصے کو انھوں نے چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، پہلا عنوان تصنیفات ''فارسی'' دوسرا ''اردو'' تیسرا ''قاطع برہان کا معرکہ'' اور چوتھا ''لطائف غیبی کا مصنف'' ہے۔اس حصے میں انھوں نے میرزا سے متعلق جملہ تصنیفات فارسی و اردو پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں کب اور کہاں سے شائع ہوئیں۔ان کتابوں کے بارے میں اتنی معلومات کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں ہیں۔

تیسرا حصہ ''عادات واخلاق'' عنوان کے تحت ۶۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس میں انھوں نے ''عادات واخلاق'' کے تحت حلیہ، لباس، خوراک، پھل، حقہ اور پان، شراب، دلی میں سکونت، رہن سہن، مطالعہ وغیرہ معلومات کو ترتیب وار اور مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔اس لحاظ سے بھی کوئی اور کتاب اس کے مثل نہیں۔

پروفیسر گیان چند جین نے صحیح لکھا کہ:

''اس سے پہلے غالب کی تین مشہور سوانح عمریاں آچکی تھیں۔حالی کی ''یادگار غالب'' ۱۸۹۷ء، غلام رسول مہر کی ''غالب'' ۱۹۳۶ء اور شیخ محمد اکرام کی غالب نامہ یا آثار غالب ۱۹۳۶ء، چونکہ نقش ثانی نقش اول سے اور نقش ثالث نقش ثانی سے بہتر ہے،

اس لیے مالک رام کی ذکر غالب پیش رو سوانح عمریوں سے زیادہ مکمل ہے، اس کا پانچواں ایڈیشن اتنا پختہ اور باترتیب ہے جیسے ایک مربوط نظم یا گٹھے ہوئے ناول کا ایک حصہ دوسرے حصے جڑا ہوا ہو۔ یہ بڑی حد تک مستند ہے۔ اوسط ضخامت کی اس کتاب میں سوانح غالب کی تمام معلومات اس طرح قابل اعتماد اور منضبط طریقے پر آ گئی ہیں کہ اسے یونیورسٹیوں کے تحقیقی و تنقیدی مقالے کا ایک مثالی نمونہ کہا جا سکتا ہے''۔(۱۹)

''ذکر غالب'' کی اہمیت کا اعتراف پروفیسر مختارالدین آرزو نے یوں کیا ہے:

''ذکر غالب'' کی خوبی یہ ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ غالب کی زندگی کے واقعات کی چھان بین کی گئی ہے اور ان کے سوانح حیات کو تحقیق کی نظر سے دیکھا گیا اور انھیں تفصیل اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے لیے دلائل فراہم کیے گئے ہیں............''ذکر غالب'' میں تاریخوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ متعدد مقامات پر سال ہی نہیں، مہینا، تاریخ اور دن تک کے تعین کی کوشش کی گئی ہے''۔(۲۰)

اور پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ذکر غالب'' پہلی بار ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ تب سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس دوران اس کی ضخامت چار گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسی اعتبار سے اس کی جامعیت اور تحقیقی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ غالب کی اتنی مکمل، اتنی مستند اور اتنی مختصر سوانح اردو میں دوسری نہیں اور شاید غالب پر لکھی گئی کسی تحقیقی کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی ''ذکر غالب'' کو۔ اس کتاب کا بنیادی جوہر اس کا نظم و ضبط، اختصار اور جامعیت ہے۔ دوسروں کا تو کیا ذکر، جن مسائل اور مباحث پر خود مالک رام نے پورے مقالے لکھے ہیں، ان کے نتائج یہاں ایک پیراگراف میں یا چند سطروں میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ غالبیات میں یہ کتاب بنیادی حوالے کا درجہ رکھتی ہے اور اگر کہا جائے کہ اس کی حیثیت جان سخن کی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا''۔(۲۱)

# حوالہ جات

(۱) الطاف حسین حالیؔ ''حیات سعدی''، پیش لفظ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، (اشاعت ۱۹۶۰ء)۔ (۲) الطاف حسین حالیؔ ''یادگار غالب''، مشمولہ عکس سرورق پہلا ایڈیشن ۱۸۹۷ء، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (اشاعت پنجم ۲۰۱۲ء)، ص ۷۔ (۳) ایضاً ص ۴۔ (۴) ڈاکٹر سید شاہ علی، ''اردو میں سوانح نگاری'' گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ص ۱۶۴ (اشاعت اول ۱۹۶۱ء)۔ (۵) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ''غالب کے چند نقاد'' غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۱۴ (اشاعت ۱۹۹۵ء)۔ (۶) آل احمد سرور، ''تنقید کیا ہے'' مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ص ۲۷-۲۸ (سنہ اشاعت ۲۰۱۱ء)۔ (۷) پروفیسر گوپی چند نارنگ، ''غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۲۹، ۳۰۔ (۸) غلام رسول مہرؔ، ''غالب''، مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور، ص ۹ (اشاعت ۱۹۳۶ء)۔ (۹) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ''غالب کے چند نقاد'' غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۳۰۔ (۱۰) ڈاکٹر شفیق احمد، ''مولانا غلام رسول مہر حیات اور کارنامے''، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۲۸۱۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵۔ (۱۲) شیخ محمد اکرام، ''غالب نامہ'' قومی کتب خانہ لاہور، ص ۶۔ (۱۳) ایضاً، ص ۶۔ (۱۴) ایضاً، ص ۷۔ (۱۵) ایضاً، ص ۹، ۱۰۔ (۱۶) پروفیسر گیان چند جین، ''رموز غالب'' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ص ۳۱۹۔ (۱۷) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ''غالب کے چند نقاد'' غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۹۱۔ (۱۸) مالک رام، ''ذکر غالب'' مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی (اشاعت پنجم)، ص ۹۔ (۱۹) پروفیسر گیان چند جین، ''غالب شناس مالک رام'' غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۲۴۔ (۲۰) پروفیسر مختار الدین احمد، مشمولہ مضمون ''مالک رام ایک مطالعہ'' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ص ۵۴، ۵۷۔ (۲۱) پروفیسر گوپی چند نارنگ، مشمولہ مضمون ''مالک رام ایک مطالعہ'' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ص ۷۶۔

---

# اخبار علمیہ

## ’’چرند و پرند کی آنکھوں میں رنگوں کی پہچان کا سافٹ ویر‘‘

متعدد حیوانوں کو یہ رنگ برنگی دنیا کس رنگ کی نظر آتی ہے محققین نے اس کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مچھلی،مکھی،مگس اور دیگر جانوروں کی آنکھ سے اس دنیا کو دیکھا جائے گا تو یہ مختلف رنگ ہوں گے۔انہوں نے ایسا سافٹ ویر تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جس کے ذریعہ مختلف جانوروں کی نگاہ میں اس تبدیلی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔گھاس انسان کو ہری نظر آتی ہے لیکن جانوروں اور شہد کی مکھی کے علاوہ دیگر پرندوں کی نگاہ میں اس کا رنگ کچھ اور ہوگا۔ماہرین کے مطابق عمر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نظر کی تبدیلی کے اثرات انسان محسوس کرتا ہے۔اسی اصول پر سافٹ ویر کے ذریعہ کسی بھی چرند و پرند کی آنکھ سے رنگوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی اور ان کے ریکارڈ جمع کرتے ہوئے یہ سافٹ ویر تیار کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے،جس کے ذریعہ یہ پتہ لگانا ممکن ہوگیا ہے کہ کسی پرندے یا جانور کو کوئی شے کس رنگ میں نظر آتی ہے؟ ۲۰۱۵ء میں اس سافٹ ویر پر کام کا آغاز کیا گیا تھا اور ریکارڈ جمع کرنے کے علاوہ ان باریکیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جارہی تھی جن کے ذریعہ رنگوں میں پیدا ہونے والے فرق کی نشاندہی ہوسکے۔اس طویل جدوجہد اور تحقیق کے جو نتائج سامنے آئے وہ کامیاب ہیں۔عالمی سطح پر اس سافٹ ویر کی ستائش کی جارہی ہے۔عالمی ماہرین علم الحیوان کی جانب سے اس کوشش کو کارنامہ قرار دیا جارہا ہے اور یہ امید جتائی جارہی ہے کہ اس کے ذریعہ چرند و پرند کو محفوظ رکھنے کے علاوہ ماحولیات کی فراہمی میں بھی مدد لی جائے گی۔اسی لیے اس سافٹ ویر کو حتی الوسع نقائص سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔(احمد ٹائمز،مارچ ۲۰۲۰ء،ص ۳۱)

---

## ’’مصر کی شہریت‘‘

وطن عزیز میں شہریت ترمیمی بل ایک متنازع مسئلہ بن گئی ہے۔بالخصوص اس کے متعلق اندیشہ ہائے دور دراز اور غیر واضح موقف کے سبب عام شہریوں میں عدم تحفظ کا احساس گہرا ہوتا جارہا ہے اور اس تنازع نے درجنوں جانیں بھی لے لیں۔یہ خبر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ مصری حکومت نے بھی ملک کے شہری قوانین میں ترمیم کی ہے۔اس ترمیم کے مطابق کوئی بھی خارجی ڈھائی لاکھ امریکی ڈالر کی جائداد غیر منقولہ خرید کر یا حکومت کے خزانہ میں ۵ لاکھ امریکی ڈالر جمع کر کے وہاں کی

شہریت کا مستحق ہوجائے گا۔ رپورٹ کے مطابق حکومت نے یہ اقدام اس لیے اٹھایا ہے تا کہ ۲۰۱۱ء کی شورش اور اس کے بعد اس ملک میں غیر ملکیوں کے پیسہ لگانے کی شرح میں کمی کے سبب ملک کی معیشت کو جس نقصان کا سامنا ہے اس سے اس کو نکالا جاسکے، حالانکہ کونسل کے اس فیصلہ پر افواہوں کا بازار بھی گرم ہے اور یہ الزام لگ رہا ہے کہ دراصل یہ فیصلہ اسرائیلیوں، ایرانیوں اور ترکوں کو شہریت دینے کی راہ ہموار کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ جب کہ دفاعی اور قومی تحفظ کے ایک رکن کا صاف طور پر یہ کہنا ہے کہ کسی کو بھی شہری ضمانت دینے سے پہلے قومی تحفظ کو پیش نظر رکھ کر شہریت دی جائے گی۔

(ینگ مسلم ڈائجسٹ (انگریزی) بنگلور، جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۴۲)

---

## ''اخبار ''این ٹی نیوز'' کے خالی صفحات کی اشاعت''

آسٹریلوی دوکانداروں نے کرونا وائرس کے خوف سے ٹوائلٹ پیپرز کی بڑی تعداد میں ذخیرہ کرنا شروع کردیا جس کے سبب وہاں اس کا بحران پیدا ہوگیا ہے۔ اس بحران سے نمٹنے کے لیے ایک مقامی اخبار ''این ٹی نیوز'' نے چند روز قبل ایک خصوصی ایڈیشن شائع کیا جس میں بالکل خالی اضافی صفحات تھے۔ پہلے صفحہ پر یہ اعلان تحریر تھا کہ اس ایڈیشن میں خاص طور پر ۸ صفحات ایسے چھاپے گئے ہیں کہ ان کو علاحدہ کرنے کے لیے نشانات موجود ہیں۔ ہنگامی حالت میں ان خالی صفحات کو ٹوائلٹ پیپر کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ آسٹریلیا کی ریٹیلرز ایسوسی ایشن اور دوسری تنظیمیں متعدد بار اعلان کرچکی ہیں کہ اگر وائرس کی وبا پھیل بھی گئی تب بھی اس قسم کی مصنوعات میں کوئی قلت پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود وہاں کے لوگ خوف اور بوکھلاہٹ میں زیادہ سے زیادہ یہ پیپر خرید رہے ہیں۔ (منصف حیدرآباد، ۱۵/ مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۲)

---

## ''سزائے موت کی تجویز''

چین میں سپریم پیپلز کورٹ، عدلیہ کونسل اور وزارت برائے عوامی تحفظ نے مشترکہ طور پر یہ تحریری بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''مین ہول ڈھکنوں'' کو توڑنے، چرانے یا ہٹانے والا شخص عوامی سلامتی کے لیے خطرہ ہے، اس لیے ایسے مجرم کے لیے سخت سزا بشمول سزائے موت بھی تجویز کی گئی ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس جرم کے مرتکبین کو سخت سزا دینے کے لیے صرف اتنی

تاویل ہی کافی ہے کہ ایک طرف تو وہ ذرائع نقل وحمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے، دوسرے عوام کی جانوں کو بھی خطرات سے دوچار کرتا ہے، تیسرے ''مین ہول'' کھلا رہے تو کاریا ٹرام کے تباہ ہونے کے لیے کافی ہے۔اس قدم کو عوامی پذیرائی بھی مل رہی ہے۔عوامی تحفظ کے سب سے بڑے ادارے سے وابستہ ایک افسر وان چن نے کہا کہ اس جرم کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے حالانکہ اس کا انسانی زندگی، ذاتی حفاظت اور جائداد کے تحفظ سے براہ راست تعلق ہے۔اس عمل کو عام یا معمولی جرم نہیں کہا جاسکتا۔اس لیے اس کے مرتکب کو سخت ترین سزا ملنی ہی چاہیے۔''چائنا ڈیلی'' کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۷ء سے ۲۰۱۹ء کے دوران ''مین ہول'' چرانے یا ہٹانے سے ۷۰/افراد یا تو ہلاک یا پھر زخمی ہوئے۔

(انقلاب وارانسی، ۱۲/مئی، ص ۸)

---

## ''۶۵ فیصد لوگوں کی قوت شامہ وذائقہ متاثر''

ایک حالیہ تحقیق میں محققین نے اس بات کا خلاصہ کیا ہے کہ کرونا مثبت مریضوں کی قوت شامہ و ذائقہ بہت حد تک کم ہوگئی ہے۔انہوں نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس کا اثر لمبے عرصہ تک رہ سکتا ہے۔اسی کے ساتھ انہوں نے اس کو کرونا کی ابتدائی علامت کے طور پر بھی نشان زد کیا ہے۔برطانیہ اور امریکا میں ایسے لوگوں کی تعداد ۶۵٪ بتائی گئی ہے۔ہارڈورڈ یونیورسٹی اور کنگس کالج، لندن سے وابستہ محققین نے کرونا علامت کی نگرانی کرنے والے ایپ کے ذریعہ ۲۶ لاکھ لوگوں پر تحقیق کی۔ان میں تقریباً ۱۷/فیصدی یعنی ۸ لاکھ ۵ ہزار لوگوں میں کرونا کی علامتیں پائی گئیں، ۹ء۴ لاکھ کے قریب افراد نے سونگھنے اور ذائقہ نہ ملنے کی شکایت کی۔

کرونا سے ہی جڑی یہ خبر بھی دلچسپ ہے جس کے مطابق اٹلی میں ہوئے حالیہ مطالعہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ دخانی عمل یعنی پان بیڑی استعمال کرنے والوں میں کووڈ-۱۹ کا خطرہ پانچ گنا کم ہوتا ہے۔اس سے پہلے فرانس میں کیے گئے مطالعہ میں بھی ایسا ہی دعویٰ کیا گیا تھا۔حالیہ تحقیق کے مطابق اٹلی کے اسپتالوں میں ۴۴۱ کرونا مثبت مریضوں میں سے صرف پانچ فیصد مریضوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت پڑی جو پان بیڑی استعمال کرتے تھے۔یہ مطالعہ شمالی اٹلی کے ایک اسپتال میں کیا گیا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر نکولا گیبا زی تھے۔(ہندی روزنامہ ہندوستان، وارانسی، ۱۳/مئی ۲۰۲۰ء، ص ۱۶)

## معارف کی ڈاک

# مکتوب بہار

سکٹا، دیوراج،
مغربی چمپارن (بہار)
۲۰۲۰ء/۵/۱۱

محترمی! السلام علیکم

معارف مئی ۲۰۲۰ء کا شمارہ اپنے Whats app پر پڑھا، اس شمارے میں کرونا وائرس پر فاضل مدیر کے شذرات فکر انگیز ہیں اور عبرت آموز بھی، حسب معمول مقالات اور دوسرے مشمولات بھی لائق مطالعہ اور قابل قدر ہیں۔

اس شمارے میں ڈاکٹر محمد فاروق صدیقی (مظفر پور) کا گراں قدر مکتوب شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے معارف فروری ۲۰ء کے شذرات میں اس مشہور شعر:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے  دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کو مشہور مجاہد آزادی رام پرساد بسمل کی طرف منسوب کیے جانے پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے ''درج بالا شعر سید شاہ محمد احسن بسمل عظیم آبادی کا ہے''۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بسمل عظیم آبادی کا نام سید شاہ محمد حسن (۱۹۰۳۔۱۹۷۷ء) تھا، بسمل تخلص اور عرف شاہ جھبو تھا، وہ شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶۔۱۹۲۷ء) کے شاگردوں میں تھے۔
(دبستان عظیم آباد، ص ۶۰)

ڈاکٹر محمد فاروق صدیقی نے اپنے مکتوب میں بسمل عظیم آبادی کی پوری غزل نقل کرنے کے بعد سید محفوظ الحسن گیاوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ غزل ۱۹۲۳ء سے قبل قاضی عبدالغفار (۱۸۸۹۔۱۹۵۶ء) کے رسالہ ''صلاح'' میں شائع ہوئی تھی اور جناب فاروق ارگلی صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ غزل علی گڑھ کے رسالہ ''صباح'' میں شائع ہوئی تھی، اس طرح یہ بات مشکوک ہوجاتی ہے کہ بسمل عظیم آبادی کی غزل صلاح میں شائع ہوئی تھی یا صباح میں؟

NCERT کی طرف سے ساتویں جماعت کے لیے مرتب ہندی کتاب ''بسنت'' کے

صفحہ ۱۳۵ پر زیر بحث شعر اور غزل رام پرساد بسمل کی طرف منسوب ہے، اس کتاب میں غزل کے کل چھ اشعار ہیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

رہروِ راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں لذتِ صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے

وقت آنے دے بتادیں گے تجھے اے آسماں ہم ابھی سے کیا بتائیں؟ کیا ہمارے دل میں ہے

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ ایک مٹ جانے کی حسرت اب دل بسملؔ میں ہے

آج مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے

اے شہید ملک وملت تیرے جذبوں کے نثار تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

معارف اور بسنت میں شائع شدہ غزلوں کے مطلع میں تو کوئی فرق نہیں ہے لیکن بقیہ پانچ اشعار میں نمایاں فرق ہے، بسنت کے ان پانچ اشعار میں جو رچاؤ اور روانی ہے وہ ڈاکٹر صدیقی کے مندرج ان پانچ اشعار میں نہیں ہے۔

اشعار کے منسوب کرنے میں غلطیاں بہت پہلے سے ہوتی رہی ہیں۔ یہاں صرف تین مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ مشہور ومعروف ناقد اور شاعر وادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم (۱۸۸۰-۱۹۵۱ء) کا یہ شعر:

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دل لکھنوی کی طرف منسوب کردیا۔ (روشنی، کراچی کا شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، ص ۲۷۵)

۲۔ عرصۂ دراز تک امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے ارباب علم نے عارف عباسی مرحوم کے درج ذیل شعر:

پھونک کر میں نے آشیانے کو روشنی بخش دی زمانے کو

کے پہلے مصرعے میں ''میں نے'' کی جگہ ''اپنے'' لکھ کر اسے بانی امارت شرعیہ ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ (۱۸۸۳-۱۹۴۰ء) کی طرف منسوب کردیا تھا، جب اس غلطی کی طرف میں نے امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدینؒ (۱۹۲۷-۲۰۱۵ء) کی توجہ دلائی (جو اس وقت ناظم امارت شرعیہ کے

عہدے پر فائز تھے) تو انہوں نے مجھ سے ثبوت طلب کیا، میں نے ان کو معارف ستمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے کے صفحہ ۱۲۹ پر عارف عباس مرحوم کی شائع شدہ غزل کا عکس بھیج دیا، تب انہوں نے میری بات تسلیم کی، اس سلسلے میں میرا ایک طویل مکتوب معارف جون ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ ادھر ۱۵/اپریل ۲۰۲۰ء کو NDTV کا نشریہ دیکھ رہا تھا، اس نشریاتی پروگرام میں ٹی وی اینکرس کے گفتگو کے دوران میں پنجاب کے وزیر صحت نے میرے اس شعر :

حسن تدبیر سے جاگ اٹھتا ہے قوموں کا نصیب
کبھی تقدیر بدلتی نہیں ارمانوں سے

کو علامہ اقبال کی طرف منسوب کر دیا، مجھے سن کر حیرت ہوئی اور افسوس بھی کہ میری زندگی ہی میں میرا شعر علامہ اقبال کی طرف منسوب کر دیا گیا، میرا درج بالا شعر میری جس غزل میں شامل ہے وہ معارف اگست ۱۹۸۱ء کے شمارے میں صفحہ ۱۵۴ پر شائع ہو چکی ہے۔

بہت پہلے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے اسی شعر کو ایک کتاب کے پیش لفظ میں درج کیا تھا، تقریباً پندرہ سال پہلے مہاراشٹر کے ایک صاحب علم (جن کا نام اس وقت یاد نہیں) کا ایک مضمون افکار ملی (نئی دہلی) میں پڑھا تھا جس میں انہوں نے درج بالا شعر کے حوالے سے ''تقدیر'' پر بھروسہ کرنے کے بجائے ''حسن تدبیر'' سے کام لینے پر زور دیا تھا، چند سال پہلے فرید بک ڈپو نئی دہلی نے اپنے کلینڈر میں اس شعر کو شائع کیا تھا لیکن کسی نے میرے نام کے حوالے سے اس شعر کو شائع نہیں کیا۔

ناچیز کی وہ غزل اگر معارف میں شائع نہیں ہوتی تو شاید اہل علم اس شعر کی اس قدر پذیرائی نہیں کرتے ، اس شعر کی شہرت و مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) ارباب علم کے حلقوں میں (خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معارف فروری کے شمارے کے شذرات میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی مدظلہ نے زیر بحث شعر کو رام پرساد بسمل کی طرف منسوب کر کے کوئی علمی خیانت نہیں کی ہے کیوں کہ وہ شعر رام پرساد بسمل کی طرف بھی منسوب ہے، ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران میں رام پرساد بسمل نے درج بالا غزل اور اس مطلع کو حصول آزادی کے جوش و ولولہ میں اتنی کثرت سے پڑھا کہ وہ غزل اور اس کا مطلع انہی کی طرف منسوب ہو گیا۔

نیاز مند

(جناب) وارث ریاضی

# علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام

## پروفیسر براؤن کا ایک دوسرا عربی خط

جناب طلحہ نعمت ندوی

معارف کے ایک شمارہ میں سید صاحب اور پروفیسر براؤن کی مکاتبت کا ایک خط محترم مولانا اجمل ایوب اصلاحی صاحب کی تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا، سید صاحب کے نام براؤن کے اور بھی خطوط ہیں جن میں ایک عربی خط کا ترجمہ مع عکس پیش خدمت ہے۔

سید صاحب سے براؤن کی مستقل مراسلت رہی ہے، شذرات سلیمانی میں ایک دوجگہ براؤن کے فارسی مکتوب کے اقتباسات درج ہیں نیز ایک فارسی مکتوب ماہنامہ فاران کراچی میں بھی کبھی دیکھا تھا جو فی الحال میرے پیش نظر نہیں ہے۔

مکتوب کا ترجمہ درج ذیل ہے:

جمعرات، ۱۱/مارچ ۱۹۲۰ء

محترمی فاضل علامہ!

آپ کا دوسرا مکتوب مجھے حاصل ہوا، میں ممنون ہوں، مجھے خوشی ہورہی ہے کہ آپ یہاں ایک مدت گزاریں گے کیونکہ میں اگلے ہفتہ کے آغاز میں اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے شہر لیوکاسٹل جارہا ہوں، ہمیں امید ہے کہ اواخر ماہ میں میری واپسی کے بعد آپ کسی دن کتب خانہ دیکھنے کے لیے تشریف لائیں گے اور میرے پاس موجود کچھ فارسی اور عربی نادر کتابیں بھی ملاحظہ فرمائیں گے، لندن میں مشرقی کتابوں کے تجارتی مکتبوں کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ آپ اس دوکان سے کتابیں خریدیں جس کا پتہ یہ ہے۔ (اصل خط انگریزی میں) میں نے اس دوکان کے مالک کو جناب والا کے تعارف کا رقعہ ارسال کردیا ہے تاکہ آں محترم کو جن چیزوں کی ضرورت ہو، ان کا حصول آسان ہو۔

---

استھانواں (بہار)۔

اسی طرح میں نے ایک تعارفی مکتوب اپنے قدیم شاگرد، ایم۔ای۔ایڈورڈ کو بھی لکھ دیا ہے، وہ برٹش میوزیم (جو ہر قسم کے علمی آثار ونوادر بالخصوص مشرق کی کتابوں کا بے نظیر ذخیرہ ہے) میں اسلامیات سیکشن کے ذمہ دار ہیں، وہ علم دوست اور انتہائی خوش مزاج انسان ہیں، وہ حسب امکان آپ کا پورا تعاون کریں گے۔

رہی میری تصانیف تو ان میں اکثر کے نام اس لفافہ میں موجود ہیں، اگر آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتائیں، میں انشاءاللہ آپ کو ہدیہ کروں گا، جو میرے لیے یادگار موقع ہوگا اور ایک طویل مسافت طے کرکے آئے ہوئے ایک ممتاز فاضل کے اکرام کا حق ادا ہو سکے گا کیونکہ آپ کا اعزاز ہماری ذمہ داری ہے۔

آپ نے میری کتاب جس کی ترتیب میں مشغول تھا کے بارے میں بھی معلوم کیا ہے یعنی تاریخ ادبیات ایران کی تیسری جلد جو عہد تاتار سے لے کر عہد صفوی کے ابتدائی دور کو محیط ہے، یہ کتاب مکمل ہو چکی ہے، ممکن ہے کہ ایک دو ماہ میں چھپ کر آجائے، اس کے بعد انشاءاللہ چوتھی جلد آئے گی۔

اور تاریخ طب (عربی) یونانی کا قصہ یہ ہے کہ میں اس کے مواد کی تلاش وتحقیق اور ترتیب میں مشغول ہوں، میں نے بہت سی نادر کتب طب عربی اور فارسی کی جمع کر لی ہیں، اس موضوع پر لندن میں میں نے چار ماہ قبل ماہر اطبا کے سامنے دو خطبے بھی دیے، بقیہ دو خطبے اس سال کے اخیر میں دوں گا اور اس پورے مواد کو انشاءاللہ کتابی شکل میں ڈھال دوں گا لیکن یہ کام بڑا مشکل ہے اور اس کے لیے بہت تحقیق اور نادر نسخوں کی ضرورت ہے جو عام طور پر مشرق ومغرب کہیں دستیاب نہیں۔

مایوسی اور قنوطیت تو کسی بھی حال میں پسندیدہ نہیں لیکن پراگندگی فکر وانتشار ذہن حصول مقصود میں مانع ہو جاتا ہے بالخصوص علمی امور میں، ارباب سیاست کی صورت حال دیکھ کر میں بیزار اور دل برداشتہ ہو چکا ہوں، وہ بے راہ روی کے شکار ہیں اور کج روی اختیار کر رکھی ہے، اس کے مقابلہ میں ہمیں ایسے رفقا اور ہم نشینوں کی صحبت حاصل ہے جن کی مجلسوں سے بیزاری نہیں ہوتی، موجودگی وعدم موجودگی ہر حال میں وہ امن پسند ہیں اور مامون رہنا اور رکھنا چاہتے ہیں۔

اخیر میں پھر میرا پر خلوص ہدیہ سلام قبول فرمایئے۔ آپ کے طول عمر کا داعی

ایڈورڈ براؤن

یوم الخمیس الحادی عشر من شهر مارت سنه ۱۹۲۰ ع

FIRWOOD,
TRUMPINGTON ROAD,
CAMBRIDGE.

حضرة المفضال العلامة
فزت بكتابكم الكريم الثاني و انا من
المتشكرين و فرحت كثيراً انكم تقيمون هنا
الى مدة لانني مسافر في اول الاسبوع الآتي
الى مدينة نيوكاستل لزيارة والدتي هناك
و ارجو انكم بعد رجوعي الى هنا في اواخر
هذا الشهر تشرفوا هذه المدينة في بعض
الايام لتنظروا في بعض آثارها العلمية
لا سيما الكتبخانة و ماعندي ايضاً
من الكتب النادرة العربية والفارسية
اما من الدكاكين المختصة لبيع الكتب
الشرقية في لندن اوصيكم لصاحب الدكان
الآتي عنوانه:
Luzac & Co.
46. Great Russell Street,
(Opposite the British Museum) London, W.C.

٢

و قد كتبت تقدمة أعرّف بها حضرتكم الى
صاحب الدكان المذكور ليسهّل لحضرتكم كلما
تريدون و تحتاجون اليه.
و ايضاً كتبت لحضرتكم تقدمة لتلميذي
السابق Mr. E. Edwards
وهو محافظ الكتب الاسلامية في مكتبة
البريتش ميوزيوم الذي ليس كمثله شئ
من حيث كثرة الآثار العلمية من كل جنس
لا سيما الكتب الشرقية و هو رجل لطيف
محب للعلم و العلماء لا شك انه يعاونكم
في كل شئ بقدر امكانه.
اما تآليفي و تصانيفي تجدون اسماء
اكثرها على الورقة الملفوفة و اذا طلبتم
شيئاً منها فأخبروني و سأهديكموه
ان شاء الله تذكاراً منّي اكراماً لنحرير
فاضل من صقع بعيد الذي يجب علينا
اكرامه.

٣

قد سألتم ايضاً عن الكتب التي اشتغل
بها الآن اعني الجلد الثالث من تاريخ
ادبيات الفرس من عهد التتر الى اوائل
الملوك الصفوية. هذا الكتاب تم تأليفه
منذ مدة و هو يكاد يخرج من المطبعة
بعد شهر او شهرين و سيليه الجلد
الرابع بعد ذلك ان شاء الله.
اما تاريخ طب العرب فأنا مشغول به
و جمعت كثيراً من الكتب الطبية النادرة
عربية و فارسية و القيت خطبتين في
هذا الموضوع على رؤساء الاطباء
في لندن قبل اربعة اشهر و سألقى
خطبتين في اواخر هذه السنة و بعد
ذلك سأجعل هذه المواد كلها كتاباً
ان شاء الله و لكن هذه مسئلة صعبة
تحتاج الى تحقيقات كثيرة شتّى و نسخ

نادرة تكاد لا توجد شرقاً ولا غرباً.
اما اليأس و القنوط فلا تكن
انهما مذمومان و لكن تفرقة الافكار
تمنع نيل المرام لا سيما في العلم
و مللت مما رأيت من السياسيين
المعوج طريقهم الضال رفيقهم بل
لنا ندماء لا نمل حديثهم
أمينون مأمونون غيباً و مشهداً
و تقبل في الختام يا سيدي المكرم
احسن تحيتي و خالص السلام
الداعي لدوام عمركم الشريف
ادوارد براون
Edward G. Browne.

# ادبیات

## نعت

☆ڈاکٹر جمیل مانوی

زندگی کی روح ہے اور روح کا حاصل ہے تو
ذوق وشوق وجستجو کی آخری منزل ہے تو

کعبۂ اہل نظر ہے ، کائنات ِ دل ہے تو
لیلیِ حق جلوہ گر ہے جس میں وہ محمل ہے تو

علم و حکمت کو ترے در سے حیاتِ نو ملی
نوح و ابراہیم کی میراث کا حامل ہے تو

گونجتی ہے ذہن میں صدیوں سے عیسیٰ کی نوید
ناز ہے ماضی کو جس پر ایسا مستقبل ہے تو

پا گیا تسکین تجھ سے اضطرابِ کائنات
وقت جس کی موج ہے اس بحر کا ساحل ہے تو

تیرے چہرے کا اجالا ہے بلند و پست پر
آسماں کی آنکھ کا تارا زمیں کا دل ہے تو

دن میں اک کوہِ عزیمت ردّ باطل کے لئے
آخرِ شب آنسوؤں کے سوز میں شامل ہے تو

سچ تو یہ ہے میں ہی اپنے پاؤں کی زنجیر ہوں
یہ کہوں کیسے کہ میرے حال سے غافل ہے تو

محفلِ نعت ِ نبی میں یہ تری شرکت جمیلؔ
تجھ پہ یہ چشمِ کرم ہے، ورنہ کس قابل ہے تو

## غزل

☆☆جناب انس مسرور انصاری

ظلمت کے سجے بازار تو دل کا اجالا خرچ کیا
میری شب تاریک پہ اس نے اپنا سویرا خرچ کیا

کوئی نہ جانے کیا کیا بیتی موسم گل کے آنے تک
باغ نے اپنی جیب چمن سے پتّا پتّا خرچ کیا

اپنی خاک نشینی اچھی کنج فلک کے تاروں سے
ہم ٹھہرے مرضی کے مالک جو بھی چاہا خرچ کیا

ہم سے پوچھو ہم نے کیسے پیاس بجھائی صحرا کی
قطرہ قطرہ خود کو سمیٹا دریا دریا خرچ کیا

دل والوں کی ہمت دیکھو نا پرسوں کی بستی میں
رات ہوئی تو چاند اگایا، دھوپ میں سایا خرچ کیا

آنسو، آہیں، نالے، شیون، بیتابی، بے خوابی، الجھن
تنہا تنہا شب بھر جاگے تنہا تنہا خرچ کیا

قیدِ ہستی سے آخر آزاد ہوئے، دل شاد ہوئے
ہم نے اپنی عمر رواں کا لمحہ لمحہ خرچ کیا

---

☆۴۳۰، گریس اکیڈمی، نور بستی، سہارن پور۔ ☆☆نیشنل اردو تحریک، سکراول، اردو بازار، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر۔ (یوپی)

## مطبوعات جدیدہ

**تاریخ ادب اردو، ٹمل ناڈو،** از ڈاکٹر جاویدہ حبیب و جناب علیم صبا نویدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰۴، قیمت ۱۱۰۰ روپے، پتہ: علیم صبا نویدی، ۲۶۶۔ٹرپلی کین ہائی روڈ، سکنڈ فلور، فلیٹ نمبر ۱۶، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی۔۶۰۰۰۰۵ اور ڈاکٹر جاویدہ حبیب، لیکچرر اکاڈمی آف اسلامک ریسرچ، بھارتی ڈاسن روڈ، ایس آئی ای ٹی، ٹینم پیٹ، چنئی۔۶۰۰۰۱۸۔

قدیم تاریخ بلکہ ماقبل تاریخ کے آثار و باقیات کی وجہ سے جنوب ہند کی ریاست ٹمل ناڈو دیکھنے اور مطالعہ و تحقیق کرنے والوں کے لیے بڑا سامان رہا ہے، زبان، تہذیب اور ثقافت میں اس کی انفرادیت آج بھی باقی ہے، ایسے میں وہاں اردو زبان و تہذیب و ثقافت کی عملداری کے قصے کچھ کم حیران کن نہیں، یہ قصے کبھی کبھی دہرائے اور سنائے جاتے رہے لیکن جس استمرار و استقلال و استقامت سے اردو کی کہانی سنانے کا فریضہ فرزند جنوب خباب علیم صبا نویدی نے انجام دیا وہ اب خود تاریخ اردو کا ایک اہم باب بن چکا ہے، خدا جانے کتنی تصنیفات و تالیفات کا ایک انبار انہوں نے لگا دیا، زبان و ادب کے تعلق سے انہوں نے ہر گوشہ پر نظر کی اور نتیجہ میں ہمیشہ ان کو خزانے ہاتھ لگے، اب زیر نظر جو کتاب بلکہ انسائیکلو پیڈیا ہے وہ اپنی ضخامت ہی نہیں اپنے مشمولات کی وجہ سے غیر معمولی حیثیت کی حامل کہی جاسکتی ہے، دیکھا جائے تو یہ فاضل مصنف کی کئی کتابوں کا مجموعہ ہے، مثلاً شروع کے تین ابواب شعرا اور ادبا کے تذکرہ پر مشتمل ہیں، ابتدائی تحریر میں شریک مرتب اور علیم صبا نویدی صاحب کی لائق دختر جاویدہ حبیب نے اس کو "ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب" کتاب سے یاد کیا ہے، دوسرے تین اور ابواب رباعی، نعت گوئی اور خواتین ٹامل ناڈو کی خدمات سے معمور ہیں، باقی حصہ میں وہاں کے اردو اداروں اور نویدی صاحب کے بارے میں ملک کے اکابر علم و ادب کی رائیں اور تقریظیں آ گئی ہیں، نویدی صاحب بذات خود عمدہ شاعر اور ادیب ہیں لیکن تحقیق اور جمع و تدوین کی ان کی صلاحیت آج ہی نہیں بہت پہلے سے قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں، آل احمد سرور ہوں یا مختار الدین آرزو، جمیل جالبی ہوں یا سلیم اختر، سب میں مشترک، حیرت کا اظہار و کرامت کا اقرار ہے، واقعی یقین نہیں آتا کہ ایک شخص کس طرح اکادمی بن جانے کا ہنر پا لیتا ہے، ٹامل ناڈو سے تعلق ہو یا اردو زبان سے محبت یا پھر اپنی عظمت رفتہ کے سراغ کی نیت ہو یا پھر آنے والی نسلوں کو بیداری و بصیرت عطا کرنے کا جذبہ ہو، نویدی صاحب کے احسانوں کو اردو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

**امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی** از ڈاکٹر ثاقب عمران، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۵۹، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، حامد منزل، رام پور۔ ۲۴۴۹۰۱، (یوپی)۔

ایک محقق عالم اور نہایت سنجیدہ اسلوب نگارش کے حامل کی حیثیت سے اردو کے ناموران علم و ادب میں امتیاز علی عرشی کا نام ہمیشہ بڑے احترام سے لیا جائے گا، فنا فی العلم کہے جانے کے وہ واقعی مستحق تھے اور اس فنائیت کے لیے انہوں نے رضا لائبریری کو گویا اپنی علمی خانقاہ میں بدل دیا، یہ تاثر بالکل صحیح ہے کہ ایک زمانہ میں اہل علم رام پور اگر جاتے تو نیت رضا لائبریری کو دیکھنے اور عرشی صاحب سے ملنے کی ضرور ہوجاتی، ان کے علمی کاموں کی سب سے بڑی شناخت تحقیق وتدوین وترتیب میں آخری درجہ کی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کی محنت تھی، جب انہوں نے تفسیر سفیان ثوری پر تحقیقی کام شایع کیا تو عالم عرب کے مشہور ترین علما جیسے شیخ محمد بہجۃ البیطار، دکتور عبدالحلیم محمود اور الاستاذ قاسم محمد الرجب نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ پورے علمائے ہند کے لیے قابل فخر ہیں، یہی نہیں مونٹگمری واٹ نے لکھ دیا کہ "مغربی محققین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عرشی صاحب کے کام کو پسند نہ کریں اور حیرت زدہ نہ رہ جائیں"، افسوس تو یہ ہے کہ ایسے بے مثال محقق کی خدمات کو شایانِ شان یاد نہیں رکھا گیا، ایسے میں اس کتاب کو دیکھنا واقعی خوش گوار حیرت سے دوچار ہونا تھا، گرچہ یہ عرشی صاحب کی علمی زندگی کے صرف ایک رخ یعنی مطالعہ غالب کے لیے خاص ہے لیکن اس رخ کی تابانی بجائے خود مسرت کی فراوانی ہے، مطالعہ غالب دراصل عرشی صاحب کی زندگانی کا سب سے غالب حصہ ہے، انہوں نے غالب کے خطوط مرتب کیے، کلام غالب کا انتخاب اور دیوان غالب شائع کیا، فرہنگ غالب مرتب کی اور ان تمام تالیفات میں انہوں نے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا ثبوت دیا اس سے تحقیق وتلاش کا ایک الگ ہی معیار سامنے آگیا، صباح الدین عبدالرحمٰن کے الفاظ میں عرشی صاحب غالب کی لیلائے شعروادب کے مجنوں تھے، اس کتاب میں لائق مصنف نے غالب سے متعلق عرشی صاحب کی ان تمام تحریروں کو یکجا کرنے کی ہمت کی جو مقالات ومضامین کی شکل میں خدا جانے کہاں کہاں بکھرے تھے، یہ مضامین ہیں یا علم کا سمندر ہیں، جن کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمہ عالم گواہ عظمت اوست، غالب کی عظمت مسلّم لیکن غالب کے حوالہ سے خود محقق کی عظمت کا مسلم ہونا ہر مدعی تحقیق کے بس میں

نہیں، جہاں تک ان مضامین کو جمع کرنے کا معاملہ ہے اس امتحان میں لائق مرتب سرخرو ہو کر نکلے ہیں، خصوصاً ان کا مقدمہ تحقیق کی دنیا میں ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے، دیوان غالب اور نسخہ حمیدیہ کے متعلق مقدمہ میں جس اختصار سے بحث کو سمیٹا گیا ہے وہ اس بحث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً تشفی کا ذریعہ بن سکتا ہے، کہیں کہیں انہوں نے ضروری حواشی بھی دیے ہیں، غالبیات کا ذخیرہ غالباً اردو کا سب سے پرثروت حصہ ہے، یہ مجموعہ اس کی قیمت میں اور اضافہ ہے۔

**علامہ سیماب اکبرآبادی - حیات وفن**، از ڈاکٹر شمیمہ اختر، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۸، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔۲۔

اردو کا دامن بھی قدرت نے کیسے کیسے لعل و جواہر سے بھر دیا، کاش اردو والے نعمتوں کی قدر کرنے والے بھی ہوتے، علامہ سیماب اکبرآبادی کے نام کی چمک اب پھیکی سی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے قلم سے تین سو سے زیادہ کتابیں نکلیں، ان کی غزلوں کے مجموعے کلیم عجم، سدرۃ المنتہٰی اور لوح محفوظ جیسے ناموں سے شائع ہوئے اور ان کو حرمت و تقدیس بھی ان ناموں ہی کی طرح ملی، کیا دماغ اور کیا زبان تھی، قرآن مجید، مسند احمد بن حنبل، سیرت خلفائے راشدین اور مثنوی معنوی کے منظوم ترجموں کی ہمت و سعادت بے شمار اردو شاعروں میں صرف سیماب صاحب کی قسمت میں آئی، ممکن ہے قسمت کی اس یاوری میں فصیح الملک داغ دہلوی کے تلمذ کی برکت بھی شامل ہو کہ داغ کی طرح خدا جانے ان کے کتنے اشعار ضرب المثل بن گئے اور اس سے بھی زیادہ سیماب کے شاگرد سخن گوئی میں اردو کے لشکر جرار بن کر فاتح زمانہ کہلائے، میر کی جہاں گیری، غالب کی شاہجہانی اور اقبال کی عالمگیری میں اپنا سکہ چلانا آسان نہیں تھا مگر سیماب نے یہ کر دکھایا، شوق گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دینے کا حوصلہ بھی عام طور پر بخشا نہیں جاتا، ان کے کلام کی روح نکتہ دروں نے تلاش کی تو معلوم ہوا کہ زبان کی ندرت میں موضوع کی ندرت گھولنے اور ایک روح پرور لطافت سے آشنا کرنے میں اسلامی و اخلاقی اقدار کی خدمت مستور تھی، ان کو خود بھی اپنے مقصد کی افادیت کا عرفان تھا

میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا     گرمیِ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

سیماب صاحب کی شاعری کے زور میں ان کے نثری کمالات کی اہمیت کچھ فروتر سی نظر آتی ہے، مگر حقیقت

یہ ہے کہ ان کے نثری مضامین، اردو زبان و ادب کے باب میں نہایت مفید اور نفع بخش ہیں، خصوصاً فن عروض کے بارے میں ان کی کتابیں حددرجہ وقیع ہیں، زیر نظر کتاب سے یہ ساری یادیں پھر سے تازہ وزندہ ہوجاتی ہیں، قریب آٹھ ابواب میں حیات و شخصیت کے ساتھ غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ نگاری، رباعی، قطعات، منظوم تراجم اور ان کے عروضی تجربوں پر حتی الامکان معلومات کو سمیٹا گیا ہے، آخر میں ایک محاکمہ بھی ہے۔

**موج خامہ** از جناب ضیاء الرحمٰن اصلاحی ضیاء اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۱۶، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

شاعر نوجوان ہیں، نوخیز ہیں، اصلاح کے عالم ہیں اور ہجرت کے ثواب کے لیے وطن سے ہزاروں میل دور، کرب و مجبوری کے اسی حکم کی تعمیل میں خطہ ارض پر قدم رکھنے والے اولین انسان کی تقلید میں وہی کہہ رہے ہیں جو اگلے کہہ گئے کہ ؎ کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر۔

بظاہر تو ان میں بے خودی کا کوئی اثر نظر نہیں آتا لیکن یہی باور کراتے ہیں کہ ؎

یہ موسموں کی شرارت ہے میری جاں ورنہ بہانے اور بھی ہیں میری بے خودی کے لیے

انسان کو تفوق و تکریم خالق کائنات کا عطیہ ہے، اسی کے سہارے یہ شعر بھی لطف آگیں بن گیا کہ ؎

فلک پہ لاکھ ہے سامان رنگ و نور مگر سبھی کو میری ضرورت ہے روشنی کے لیے

چھوٹی سی عمر میں تخیل کی وسعتیں ممکن ہیں لیکن تفکر اور جذبوں کی گہرائی بہرحال حیرانی کا سبب ہے، اب یہی شعر ملاحظہ ہو، کسی استاد کی یاد دلاتا نظر آتا ہے کہ ؎

میں کہ تیری جستجو میں چارسو مارا پھرا تو ملا تو یوں کہ ہر جانب ہے جیسے تو ہی تو

واقعی شاعری بس خدا کی دین ہے جسے چاہے وہ عطا کرے، غزلیں ہیں اور دوسرے اصناف سخن میں طبع آزمائی کی کاوشیں ہیں، زیادہ تر کلام عنفوان شباب کی شاعری ہے، اگر شمار کیا جائے تو شاعر کی عمر دیکھتے ہوئے اسے نامناسب نہیں کہا جاسکتا لیکن جابجا وہ اشعار بھی ہیں جو بے ساختہ عمر رسیدہ لبوں پر واہ لے آتے ہیں، یہی شاعر کی بڑی کامیابی ہے، موج خامہ کے پیچھے کیا ہے، وہی عکس خیال یار یا دوسری تعبیر میں جلوہ گری بہار، کوئی تو بات ہے مولانا عمر اسلم اصلاحی جیسی متقی و ثقہ شخصیت نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''اس اعظمی شاعر کی ضیا میں اپنا عکس ڈال کر اسے دھندلا کردینا مناسب نہیں''، خدا کرے موج ہی نہیں موجوں میں وہ اضطراب پیدا ہوجائے جو ساحلوں سے آشنائی کا سبب بن جاتا ہے۔

(ع۔ص)

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- |
| سیرۃ النبیؐ | |
| (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) | 2200/- |
| علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی | |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- |
| الفاروق | 300/- |
| الغزالی | 200/- |
| المامون | 175/- |
| سیرۃ النعمان | 300/- |
| سوانح مولانا روم | 220/- |
| شعرالعجم اول | 300/- |
| شعرالعجم دوم | 150/- |
| شعرالعجم سوم | 125/- |
| شعرالعجم چہارم | 200/- |
| شعرالعجم پنجم | 150/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | 350/- |
| (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | |
| الکلام | 250/- |
| علم الکلام | 200/- |

| کتاب | | قیمت |
|---|---|---|
| موازنہ انیس ودبیر | | 250/- |
| اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر | | 100/- |
| سفرنامہ روم ومصر وشام | | 200/- |
| کلیات شبلی (اردو) | | 220/- |
| کلیات شبلی (فارسی) | | 45/- |
| مقالات شبلی اول (مذہبی) | | 170/- |
| | مرتبہ: سید سلیمان ندوی | |
| مقالات شبلی دوم (ادبی) | 〃 | 70/- |
| مقالات شبلی سوم (تعلیمی) | 〃 | 80/- |
| مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) | 〃 | 200/- |
| مقالات شبلی پنجم (سوانحی) | 〃 | 150/- |
| مقالات شبلی ششم (تاریخی) | 〃 | 90/- |
| مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) | 〃 | 100/- |
| مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) | 〃 | 110/- |
| خطبات شبلی | مرتبہ: عبدالسلام ندوی | 80/- |
| انتخابات شبلی | مرتبہ: سید سلیمان ندوی | 45/- |
| مکاتیب شبلی اول | 〃 | 150/- |
| مکاتیب شبلی دوم | 〃 | 190/- |
| اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات) | | 250/- |

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
JUNE 2020 Vol - 205 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

## دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | سیرالصحابہ اول | حاجی معین الدین ندوی | 300/- |
| ۲۔ | سیرت عائشہؓ | مولانا سید سلیمان ندوی | 220/- |
| ۳۔ | حیات شبلی | مولانا سید سلیمان ندوی | 650/- |
| ۴۔ | تذکرۃ الفقہاء اول | مولانا عمیر الصدیق ندوی | 150/- |
| ۵۔ | مولانا ابوالکلام آزاد | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 240/- |
| ۶۔ | حکیم الامت۔نقوش وتاثرات | مولانا عبدالماجد دریابادی | 400/- |
| ۷۔ | علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 180/- |
| ۸۔ | تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد | شاہ معین الدین احمد ندوی | 370/- |
| ۹۔ | تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد | شاہ معین الدین احمد ندوی | 500/- |
| ۱۰۔ | تاریخ دولت عثمانیہ اول | محمد عزیر (علیگ) | 300/- |
| ۱۱۔ | تاریخ دولت عثمانیہ دوم | محمد عزیر (علیگ) | 300/- |
| ۱۲۔ | تاریخ ارض القرآن (اول ودوم) | مولانا سید سلیمان ندوی | 375/- |
| ۱۳۔ | تاریخ اندلس اول | سید ریاست علی ندوی | 350/- |
| ۱۴۔ | تاریخ اندلس دوم | سید ریاست علی ندوی | 220/- |
| ۱۵۔ | تاریخ اندلس سوم | سید ریاست علی ندوی | 300/- |
| ۱۶۔ | مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت | محمد سعود عالم قاسمی | 300/- |
| ۱۷۔ | عہداورنگ زیب میں علما کی خدمات | ڈاکٹر علاء الدین خاں | 380/- |
| ۱۸۔ | تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں | ظفرالاسلام اصلاحی | 100/- |
| ۱۹۔ | آثارِ شبلی | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 500/- |